الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

لڑائی کے بغیر بھی جیت ہوتی ہے
مگر لڑائی کے بغیر جیتنے کے لیے
اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے

شمارہ ۱۴۳
اکتوبر ۱۹۸۸

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge,* translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah,* which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"*... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind*".

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) 81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۳ اکتوبر ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

مطلوب بندے

عن ابی ایوب الانصاری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل لرجل ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال یلتقیان فیعرض ھذا ویعرض ھذا وخیرھما الذی یبدأ بالسلام (متفق علیہ)

حضرت ابو ایوب انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن تک چھوڑے رکھے۔ دونوں کا سامنا ہو تو یہ ادھر منہ پھیر لے اور وہ اُدھر منہ پھیر لے۔ اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جنھیں نمایاں ہونے کا کوئی شوق نہ تھا۔ وہ گم نامی میں جیے اور گم نام ہی اس دنیا سے چلے گیے۔ جنھوں نے جو کچھ کیا صرف اللہ کے لیے کیا، ان کی کوئی اور غرض اس میں شامل نہ تھی، جو اتنا بے نفس تھے کہ اگر کسی بھائی سے بگاڑ کی بات ہو گئی تو انھوں نے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے پہل کی۔

اس دنیا میں بگاڑ کا پیش آنا فطری ہے۔ مگر بگاڑ پر قائم رہنا سرکشی ہے۔ جو شخص بگاڑ پر قائم رہے، وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ خود پرستی کا مریض ہے۔ وہ اپنی ذات کو حق سے بلند سمجھتا ہے۔ وہ اپنی خواہش کو وہ مقام دے رہا ہے جو مقام خدا کو دیا جانا چاہیے۔ حق کا مجروح ہونا اسے گوارا ہے، مگر اپنی ذات کا مجروح ہونا اسے گوارا نہیں۔

ایسے ہی لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب کسی سے کوئی شکایت کی بات ہو جاتی ہے تو وہ غصہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اس سے سلام و کلام بند کر دیتے ہیں۔ حتی کہ جب جذبات ٹھنڈے پڑتے ہیں اور انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اس وقت بھی وہ دوبارہ تعلقات پیدا کرنے میں پہل نہیں کرتے۔ وہ اس کو اپنے لیے سُبکی سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے پہل کی تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔

اس قسم کے خیالات یقیناً شیطانی وسوسہ ہیں۔ اور مومن کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے وسوسوں سے بچے۔ وہ اللہ کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دے۔

زمین سے محروم

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق ۱۷ اگست ۱۹۸۸ کو ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوگیے۔ اس واقعہ پر ٹائمس آف انڈیا (۱۸ اگست ۱۹۸۸) نے جو اڈیٹوریل شائع کیا ہے، اس کی سرخی پاکستان بغیر ضیاء (Pakistan without Zia) کے الفاظ میں قائم کی ہے۔ اس کو میں نے پڑھا تو معاً میرے ذہن میں ایک اور سرخی آگئی جس کے الفاظ یہ تھے: ضیاء بغیر پاکستان (Zia without Pakistan)

اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ یہ ضیاء الحق کے لیے دنیا سے آخرت کی طرف سفر تھا، تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ پاکستان سے زیادہ خود ضیاء الحق کا مسئلہ ہے۔ اب تک وہ ایک ایسی دنیا میں تھے جہاں وہ خود مطلق حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ساری حاکمیت صرف ایک اللہ کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی کو وہاں کوئی حاکمیت یا اختیار حاصل نہیں۔

صدر ضیاء الحق پاکستان کی زمین پر کھڑے ہوئے تھے، موت نے بے رحمانہ طور پر ان کو اس زمین سے جدا کر دیا۔ اسی طرح ہر آدمی "ضیاء" ہے اور ہر آدمی کسی "پاکستان" کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ کوئی شخص کسی ملک کے اوپر اور کوئی کسی ادارہ کے اوپر۔ کوئی کسی عہدہ کے اوپر اور کوئی مصلحت پرستی کے اوپر۔ کسی کو اگر واقعی زمین نہیں ملی تو اس نے جھوٹ اور فریب کی زمین پر اپنے آپ کو کھڑا کر رکھا ہے۔ غرض ہر آدمی کی ایک زمین ہے اور ہر آدمی اپنی زمین پر پاؤں جمائے ہوئے کھڑا ہوا ہے۔

مگر موت ہر ایک کو اس کی زمین سے جدا کر دیتی ہے۔ ضیاء الحق کے لیے یہ دن ۱۷ اگست مقرر تھا۔ اسی طرح ہر آدمی کا ایک "۱۷ اگست" ہے جو ٹھیک اپنے وقت پر آجاتا ہے اور آدمی کو اس کی زمین سے محروم کر دیتا ہے، خواہ وہ خشکی میں ہو یا سمندر میں یا ہوا میں۔ موت کا فرشتہ ہر جگہ عین وقت پر اس کو پکڑ لیتا ہے اور اس کو اس کی زمین سے جدا کر کے بے یار و مددگار حالت میں خدا کی عدالت میں پہنچا دیتا ہے۔

ایک اخبار نے موت کو المناک خاتمہ (Tragic end) کہا تھا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ موت ایک المناک آغاز ہے۔ یہ یومِ عمل سے نکل کر یومِ حساب میں داخل ہونا ہے۔ کیسا عجیب ہے وہ خاتمہ جو عجیب تر آغاز میں تبدیل ہو جائے۔

نبوّت اور ختمِ نبوّت

کچھ لوگوں سے ختم نبوت کے عقیدہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب قیامت تک کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی نقلی اور عقلی دلیلیں علما نے بیان کی ہیں، میں خود بھی اس پر اپنی کتابوں میں کافی لکھ چکا ہوں، اگر آپ اس موضوع کا علمی اور تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو ان کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔ تاہم دوسری باتوں کے علاوہ، یہ واقعہ بذات خود اس کی دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد دنیا میں کوئی اور پیغمبر ظاہر نہ ہو سکا۔ یہ ایک واقعاتی ثبوت ہے جو بتاتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد یہ سلسلہ عملی طور پر منقطع ہے۔

میں نے کہا کہ پیغمبر ہونا اس قسم کی کوئی سادہ سی بات نہیں جیسے ایک شخص خطیب یا شاعر بن جاتا ہے۔ کسی انسان کا پیغمبر ہونا انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ جس طرح ساری تاریخ میں کبھی کوئی شخص یہ نہ کہہ سکا کہ میں کائنات کا خالق ہوں۔ اسی طرح کوئی غیر پیغمبر یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ پیغمبری کا دعویٰ یا تو کوئی پاگل شخص کرے گا، یا وہ شخص کرے گا جو واقعۃً پیغمبر ہو۔

اس سلسلہ میں میں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بتایا۔ میں نے کہا کہ ایک باباجی تھے جن کے پیروؤں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ۱۹۸۰ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے کچھ پیروؤں سے ایک بار میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے باباجی (Prophet of the time) (وقت کے پیغمبر) ہیں۔ میں نے بلا بحث ان سے کہا کہ آپ مجھے اپنے باباجی کے پاس لے چلئے اور ان سے کہئے کہ میرے سامنے وہ اپنی زبان سے یہ جملہ دہرائیں کہ "میں وقت کا پیغمبر ہوں"۔

اپائنٹمنٹ کے ذریعہ وقت طے ہوا۔ وہ لوگ مجھے باباجی کے ہیڈ کوارٹر پر لے گئے۔ وہاں کئی لوگوں کی موجودگی میں باباجی سے ملاقات ہوئی۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ان کی مجلس میں شریک رہا۔ مگر باباجی اپنی زبان سے یہ الفاظ دہرانے کی ہمت نہ کر سکے کہ "میں وقت کا پیغمبر ہوں"۔ وہ صرف دوسری دوسری باتیں کرتے رہے۔ میں نے باباجی سے کہا کہ آپ کے پیروؤں نے مجھے

بتایا ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ میں وقت کا پیغمبر ہوں، مگر باباجی نے اس کا کوئی براہ راست جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ میں وہاں سے واپس چلا آیا۔

جن لوگوں سے یہ گفت گو ہورہی تھی، انھوں نے دوبارہ کہا کہ مگر مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸-۱۸۳۹) نے تو اپنے بارہ میں پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ خلل ذہنی کا شکار تھے، وہ کوئی صحیح الدماغ آدمی نہ تھے۔ ایسا شخص کوئی بھی لغو بات کہہ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا غیر فصیح کلام خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کسی پیغمبر کا کلام نہیں۔

تاہم اس سے قطع نظر، ان کے اصل دعویٰ پر غور کیجئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ظلّی یا بروزی پیغمبر ہیں۔ یعنی وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز (Reappearance) ہیں۔ ان کا یہ قول اپنی تردید آپ ہے۔ جب وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز ہیں تو قدرتی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں جانچ کر ان کے دعویٰ کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کیا جانا چاہئے۔ یہ کہہ کر مرزا غلام احمد قادیانی نے خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر جج مان لیا۔ بالفاظ دیگر ان کی نبوت کو جانچنے کا معیار خود وہ ذات قرار پائی جو اپنے بعد کسی اور نبی کا پیشگی انکار کر چکی ہے۔ یہ کیسی عجیب تردید ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے خود ہی اپنے خلاف فراہم کر دی ہے۔

اب مرزا غلام احمد قادیانی کو پیغمبر ماننے کی شرط اول یہ ہوگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تعلیمات سے یہ ثابت کیا جائے کہ آپ کے بعد ظلّی یا بروزی پیغمبر آئیں گے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے پورے ذخیرہ (نیز قرآن) میں اس کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں۔ قرآن میں آپ کو خاتم النبیین بتایا گیا ہے (الاحزاب ۴۰) اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً یہ فرما دیا ہے کہ میرے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ میرے بعد نبوت کے ایسے دعویدار تو اٹھ سکتے ہیں جن کا جھوٹا ہونا عیاناً ثابت ہو، مگر میرے بعد کسی سچے نبی کی آمد ممکن نہیں:

عن ثوبان، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم .... وانہ سیکون فی امتی کذابون ثلاثون، کلھم

حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا .... اور یہ کہ میری امت میں تیس جھوٹے ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک

یزعم انہ نبی ، وانا خاتم النبیین لا نبیَّ   گمان کرے گا کہ وہ نبی ہے۔ حالاں کہ میں آخری
بعدی   (ابوداؤد ، کتاب الفتن)   نبی ہوں۔ میرے بعد کوئی اور نبی نہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا اپنے آپ کو محمد عربی کا بروزی پیغمبر کہنا ایک خود تردیدی دعویٰ ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ جب پیغمبر اسلام نے خود یہ نہ کہا ہو کہ میرے بعد میرا بروز ہو گا۔ یا آئندہ میرا بروزی پیغمبر آئے گا تو کیسے یہ مانا جاسکتا ہے کہ آپ کا بروز ہوا۔ ایسی حالت میں تو یہ دعویٰ اپنے آپ کٹ جاتا ہے۔

اسی داخلی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی موت کے بعد ان کی جماعت میں توجیہہ و تعبیر کا اختلاف پیدا ہوا اور ان کا فرقہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک فرقہ (احمدی فرقہ) نے ان کو مذکورہ معنوں میں نبی کہا۔ اور دوسرے فرقہ (لاہوری فرقہ) نے کہا کہ وہ صرف مجدد تھے۔

تاریخ کی تصدیق

پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور پر جلد ہی ڈیڑھ ہزار سال پورے ہونے والے ہیں۔ مگر اب تک ساری دنیا میں کوئی ایک بھی قابلِ ذکر شخص پیدا نہیں ہوا جو مستقل نبوت کا دعویٰ کرے، اور اس کا دعویٰ تاریخ میں برقرار رہے۔

آپ کے زمانہ میں عرب کے مسیلمۃ الحنفی (م ۶۳۳ ء) نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مگر اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں محمدؐ کے ساتھ کارِ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں (إنّی قد اُشرکتُ فی الامر معہ) آپ نے اس کے شریکِ نبوت ہونے کا انکار کیا، اس لیے اس کا دعویٰ بے بنیاد ہو کر رہ گیا۔ عراق کے المتنبی (۹۱۵-۹۶۵ ء) نے جزئی نبوت کا دعویٰ کیا۔ مگر اپنی زندگی ہی میں وہ اپنے دعویٰ سے دست بردار ہو گیا۔ پنجاب کے گرونانک (۱۴۶۹-۱۵۳۹ ء) کو ان کے کچھ معتقدین اپنے طور پر پیغمبر کہہ دیتے ہیں۔ مگر خود انھوں نے کبھی اپنے آپ کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ ان کے اپنے کلام کے مطابق، انھیں صرف ایک مذہبی یا روحانی پیشوا کہا جاسکتا ہے۔ ایران کے بہاء اللہ (۱۸۱۷-۱۸۹۲) کا معاملہ بھی یہی ہے۔ انھوں نے پیغمبر خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ یعنی شیعہ عقیدہ کے مطابق، بارھواں امام جو رسول کی جگہ آئے گا۔ گویا ان کا دعویٰ جانشین رسول ہونے کا تھا نہ کہ رسول ہونے کا اسی طرح ہندستان کے غلام احمد قادیانی (۱۸۳۹-۱۹۰۸) نے اپنے آپ کو ذیلی پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا۔

مستقل پیغمبر کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی ہمت نہ کر سکے ۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب ایک مورخ مزید آگے بڑھ کر یہ کہنے پر مجبور ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آیا۔ آپ کے زمانہ میں جو چیز پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی، آج وہ ایک تاریخی واقعہ بن چکی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ گنجائش ہے کہ آپ کے خاتم الرسل ہونے پر شبہہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان کے لیے آپ عقیدہ کے اعتبار سے خاتم الرسل ہیں، اور دوسرے لوگوں کے لیے تاریخی واقعہ کے اعتبار سے خاتم الرسل ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں خاتم النبیین (Seal of the prophets) کہا گیا ہے۔ یعنی نبیوں کی مہر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے نبوت کے سلسلہ پر آخری مہر لگا دی۔ اب اس فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ ہونے والا نہیں۔ اسی بات کو آپ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا کہ انی آخر الانبیاء (میں آخری نبی ہوں)

نزول قرآن سے لے کر اب تک کے زمانہ کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے یہ الفاظ تاریخ کا فیصلہ بن گیے۔ اس طویل مدت میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بحیثیت نبی کے اٹھا ہو یا واقعی معنوں میں اس نے اپنی نبوت کا دعوی کیا ہو۔ آپ کے بعد کی تاریخ کا پورا ذخیرہ ایسے کسی شخص کے تذکرے سے خالی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب میں بعض مصلح قسم کے افراد کے اٹھنے کی خبر دی گئی ہے۔ اسی امکان کو کچھ افراد نے اپنی شخصی حوصلہ مندی کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً حدیث میں ایک " مہدی " کا ذکر ہے جس کو سنی مسلمان سادہ معنوں میں اور شیعہ حضرات مبالغہ آمیز معنی میں لیتے ہیں۔ اس کے حوالے سے کچھ لوگ مہدی ہونے کے دعویدار بن گیے۔ مسیحیت میں نیز اسلام میں حضرت مسیح کی آمد ثانی کا ذکر ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگ کہنے لگے کہ میں مسیح موعود ہوں۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھگوان کے اوتار لینے کا تصور پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اوتار کے روپ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد اٹھنے والے تمام مدعیوں کا معاملہ، ایک یا دوسری صورت میں یہی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعد جن مدعیانِ نبوت کا نام لیا جاتا ہے، وہ غلط طور پر لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ نبوت کی زمین پر نہیں اٹھے بلکہ دوسری زمینوں پر اٹھے۔ نبوت کی زمین آپ کے بعد

ایک ممنوعہ زمین بن گئی ، اور عملاً وہ آج تک ممنوعہ زمین بنی ہوئی ہے ۔

نبوت ، کارِ نبوت

اس معاملہ میں صحیح بات یہ ہے کہ نبوت کا تسلسل ختم ہو گیا ، مگر کارِ نبوت کا تسلسل جاری ہے ۔ ایک انسان کا نبی کی حیثیت سے منتخب کیا جانا اور فرشتہ کے ذریعہ اس کا باقاعدہ ربط خدا سے قائم ہونا ، یہ ایک انتہائی غیر معمولی اور استثنائی واقعہ ہے ۔ اس قسم کا واقعہ صرف اس وقت ظہور میں لایا جاتا ہے جب کہ خدا کی ہدایت محفوظ صورت میں موجود نہ ہو ۔ یہی واحد فیصلہ کن سبب ہے جو نبی کی پیدائش کو ضروری قرار دیتا ہے ۔ مگر اب قرآن کی صورت میں خدا کی کتاب مکمل طور پر محفوظ ہو چکی ہے ، اس لیے اب کسی نئے نبی کی آمد کا سبب بھی باقی نہیں رہا ۔ اب طالبانِ حق کو کسی نئے پیغمبر کا انتظار نہیں کرنا ہے بلکہ پیغمبرِ آخر الزماں کے اسوہ کی روشنی میں خدا پرستی کے تقاضے پورے کرنا ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ زندگی کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں ، وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے ۔ اس بنا پر بار بار ضرورت ہوتی ہے کہ بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں ازسرِنو خدا کا حکم معلوم کیا جائے ۔ مگر حالات کی تبدیلی کے مسئلہ کا حل اجتہاد ہے نہ کہ نئی نبوت ۔ قرآن اور حدیث میں تمام ضروری اور بنیادی احکام بتا دیئے گئے ہیں ۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ حالات کو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں جانچیں ۔ اور اصل کے ذریعہ فرع کا اور کل کے ذریعہ جزء کا حکم معلوم کریں ۔ اب ہمیں نئی نبوت کی ضرورت نہیں ۔ اب ہمیں صرف اس عالمانہ بصیرت کی ضرورت ہے جو " قدیم " احکام کو سمجھے اور " نئے " حالات پر ان کا انطباق (Application) دریافت کر سکے ۔

سب سے بڑا مسئلہ

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے ہندستانی مسلمانوں کے درمیان دو قسم کی قیادتیں ابھریں۔ ایک باریش قیادت اور دوسری بے ریش قیادت۔ بظاہر دونوں کے درمیان زبردست اختلافات تھے۔ ایک متحدہ ہندستان کی حامی تھی، اور دوسری منقسم ہندستان کی حامی۔ مگر اس اعتبار سے دونوں یکساں تھے کہ دونوں نفرت کی زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کا سرمایہ نفرتِ انگریز تھا، اور دوسرے کا سرمایہ نفرتِ ہندو۔

باریش قیادت کی نفرت کا نشانہ انگریز تھا۔ اگر مسلمانوں نے باریش قیادت کا ساتھ دیا ہوتا تو انگریز کے ہندستان سے چلے جانے کے بعد شاید نفرت کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی اور مسلمان دوبارہ معتدل زندگی گزارنا شروع کر دیتے۔ مگر مخصوص اسباب کے تحت بے ریش قیادت کو کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد بے ریش قیادت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی۔ چونکہ بے ریش قیادت کی نفرت کا نشانہ ہندو تھا، اور ہندو تقسیم کے بعد بدستور اپنی حالت پر باقی رہا، ہندستانی مسلمانوں کے لیے اندرونی حریف کے طور پر، اور پاکستانی مسلمانوں کے لیے سرحدی حریف کے طور پر، نتیجہ یہ ہوا کہ نفرت والی سیاست کا تسلسل بدستور سرحد کے دونوں طرف جاری رہا۔

یہ بات خواہ کتنی ہی زیادہ تلخ ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ موجودہ مسلمانوں کا واحد سرمایہ جس پر وہ جی رہے ہیں وہ محبت نہیں بلکہ نفرت ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کے درمیان وہی اخبارات سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں جو انھیں نفرت کی شراب پلائیں۔ ان کے درمیان وہی افراد قائد بن کر ابھرتے ہیں جو نفرت کے لہجہ میں بات کریں۔ وہ انھیں نعروں پر سب سے زیادہ متحرک ہوتے ہیں جن کے اندر نفرت کی چاشنی موجود ہو۔

مسلمانوں کی نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نفرت کے اس گڑھے سے نکالیں اور محبت کی زمین پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ ورنہ یقینی ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آجائیں گے، اور انھیں کے ساتھ ان کے وہ اکابر بھی جو مسلمانوں کو اس خلافِ اسلام مشغلہ میں دیکھتے ہیں، پھر بھی وہ انھیں نہیں ٹوکتے۔

اپنی طرف مارچ

۱۹۴۵ سے پہلے جاپانی ایک لڑاکا قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں انھوں نے وحشیانہ بہادری کی حد تک اپنے جنگی جنون کا ثبوت دیا۔ مگر ۶ اگست ۱۹۴۵ کو جب ایٹم بم نے ان کے دو صنعتی شہروں کو تباہ و برباد کر دیا تو اس کے بعد جاپان میں ایک نیا ذہن ابھرا جس کو انھوں نے عمل معکوس (Reverse course) کا نام دیا۔ یعنی جنگ کے طریقہ کو چھوڑ کر امن کے طریقہ سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔ عمل معکوس کی یہ تدبیر نہایت کامیاب رہی۔ جاپان جنگ کے ذریعہ جو کچھ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کو اس نے امن کے ذریعہ زیادہ شاندار طور پر حاصل کر لیا۔

یہ عمل معکوس (ریورس کورس) اپنی تدبیری نوعیت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جو اسلام کی تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں وہ اس کو پائے تو وہی سب سے زیادہ اس کا حقدار ہے (الحکمۃ ضالۃ المومن فاین وجدھا فھو احق بھا) اس اعتبار سے یہ جاپانی حکمت عین اسلامی حکمت ہے۔ اور اہل اسلام سب سے زیادہ یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ اس کو اپنی تعمیر نو کے لیے استعمال کریں۔

مسلمان سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے دوسروں کی طرف مارچ کا تجربہ کر رہے ہیں ——— مرہٹوں اور سکھوں کی طرف مارچ، انگریزوں کی طرف مارچ، ہندوؤں کی طرف مارچ، حکمرانوں کی طرف مارچ، نئی دہلی اور اجودھیا کی طرف مارچ۔ دوسروں کی طرف مارچ کی اس سیاست میں مسلمانوں نے کھویا تو بہت ہے، مگر پایا کچھ نہیں ہے۔ اب میں مسلمانوں کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ وہ "ریورس کورس" کے اصول پر عمل کریں۔ وہ دوسروں کی طرف مارچ کے طریقہ کو چھوڑ دیں اور اپنی طرف مارچ کے طریقہ کو اختیار کر لیں۔ دوسروں کی طرف مارچ میں انھوں نے اگر دو سو سال ضائع کیے ہیں، تو اپنی طرف مارچ میں صرف دو سال لگا دیں، اور اس کے بعد دیکھیں کہ کون سا طریقہ زیادہ مفید ہے۔ دوسروں کی طرف مارچ کا یا اپنی طرف مارچ کا۔

دوسروں کی طرف مارچ میں مسلمانوں کا قافلہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ مگر اپنی طرف مارچ میں ہر قدم اگلا قدم ہے، اس میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

زندگی کا راز

۱۹۴۷ میں برصغیر ہند کو آزادی ملی تو ایک طرف اہل پاکستان تھے جن کی نمائندگی کرتے ہوئے مسٹر محمد جناح نے کہا کہ ہم کو کٹا پٹا اور کرم خوردہ پاکستان (Truncated and moth-eaten Pakistan) ملا ہے۔ ان کے خوابوں کے پاکستان میں پنجاب اور بنگال کا پورا صوبہ شامل تھا۔ وہ پورے کشمیر کو اپنے ملک کا حصہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے موجودہ پاکستان انھیں اپنی امیدوں سے کم نظر آیا۔

دوسری طرف اہل ہند کا حال بھی یہی ہوا۔ یہاں کے لوگوں کے ذہن میں آزاد ہندستان یا سوتنتر بھارت کا جو تصور تھا، موجودہ ملک اس سے کم تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد بھی کروروں لوگ اسی احساس کا شکار رہے کہ ان کا محبوب بھارت انھیں ٹکڑے ہو کر ملا ہے۔ انھوں نے جو کچھ چاہا تھا، اس سے بہت کم ہے وہ جو عملاً انھیں حاصل ہوا ہے۔

آزادی بظاہر پانے کے انجام پر ختم ہوئی تھی۔ مگر مذکورہ اسباب کی بنا پر اس نے نہ پانے کے احساس کی صورت اختیار کر لی۔ سرحد کے دونوں طرف سیاسی محرومی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ کر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ گیے۔ دونوں اس کوشش میں مصروف ہو گیے کہ یا تو ماضی کی سیاسی امنگوں کو دوبارہ واقعہ بنائیں یا کم از کم ایک دوسرے کے خلاف کارروائیاں کر کے اپنے سینہ میں جلتی ہوئی احساس محرومی کی آگ کو ٹھنڈا کریں۔

اس سے مختلف مثال جاپان کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے اس کا جغرافی رقبہ بھی گھٹا دیا اور اس کی سیاسی اور فوجی آزادی بھی اس سے چھین لی۔ مگر اہل جاپان نے کھوئی ہوئی چیز کو بھلا دیا۔ اور جو چیز اب بھی انھیں حاصل تھی، اس پر قناعت کرتے ہوئے عملی جدوجہد شروع کر دی ——— چالیس سال بعد آج جاپان ترقی کی چوٹی پر پہونچ گیا ہے، اور ہندستان اور پاکستان کے حصہ میں صرف یہ آیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے الفاظ کا جھوٹا طوفان برپا کرتے رہیں۔

زندگی کم تر پر راضی ہونے کا نام ہے۔ اس دنیا میں جو کم پر راضی ہو جائے وہ زیادہ پاتا ہے۔ اور جو کم پر راضی نہ ہو، وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے اور زیادہ سے بھی۔

دعوت کے حدود

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو نصیحت کرو، کیوں کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو (الغاشیہ ۲۲) اسی طرح دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ تم لوگوں کے اوپر جبر کرنے والے نہیں ہو، پس تم قرآن کے ذریعہ اس شخص کو نصیحت کرو جو میرے ڈرانے سے ڈرے (ق ۴۵) حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

عن ابی موسیٰ قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا بعث احداً من اصحابہ فی بعض امرہ قال "بشروا ولا تنفروا، ویسروا ولا تعسروا" (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب میں سے کسی کو کسی کام پر بھیجتے تو فرماتے کہ خوش خبری دو اور متنفر نہ کرو، آسانی پیدا کرو اور لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو۔

اس طرح کی آیتیں اور حدیثیں گویا دعوت کے عمل کی حد بندی کر رہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو ابلاغ کے دائرہ میں رہ کر کام کرنا ہے، اس کو اجبار کے دائرہ میں داخل نہیں ہونا ہے۔ اس کو یہ حق ہے کہ وہ سمجھانے بجھانے کے تمام ذرائع کو استعمال کرے۔ مگر اس کو یہ حق نہیں کہ وہ تخریبی طریقہ اختیار کرکے لوگوں کو مجبور کرنے لگے۔ مثال کے طور پر فیملی پلاننگ کو لیجئے۔ فیملی پلاننگ کا موجودہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ یہاں ایک داعی کو یہ کرنا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ اسلامی نقطۂ نظر کو ثابت کرے۔ اور اس طرح اس کے بارے میں لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ اس طریقہ کی ایک مثال راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن (صفحہ ۲۳ - ۲۶) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کچھ لوگ "اینٹی فیملی پلاننگ مہم" چلائیں۔ وہ فیملی پلاننگ کے پوسٹر پھاڑیں، اخباروں کو جلائیں اور دکانوں کو بند کرائیں، تو اس قسم کی مہم درست نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ دعوت نہیں ایجی ٹیشن ہے۔ یہ ابلاغ کی حد کو پار کرکے اجبار کی حد میں داخل ہونا ہے، اور اس قسم کا تجاوز داعی کے لیے جائز نہیں۔ ایسا طریق کار لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا سبب بنتا ہے، جب کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کریں۔ اس قسم کی "اینٹی" مہم چلانا گویا دعوتی مواقع کو قتل کرنا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تخریب کاری ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

۴۵ سال بعد

فرینک بورگن (Frank P. Bourgin) نے امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی سے اقتصادی تاریخ کے موضوع پر ریسرچ کیا۔ انھوں نے اپنا ۶۱۷ صفحات کا مقالہ تیار کر کے یونیورسٹی کے حوالہ کر دیا۔ یہ ۱۹۴۲ کا واقعہ ہے۔ مگر یونیورسٹی کے پولیٹکل سائنس کے شعبہ نے ان کے مقالہ کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ آدم اسمتھ (Adam Smith) کے فکری غلبہ کا زمانہ تھا۔ امریکی دانشور اس وقت آدم اسمتھ کے زیر اثر آزاد معیشت (Laissez-faire) کو مقدس عقیدہ کا درجہ دیئے ہوئے تھے۔ مسٹر بورگن کا مقالہ اس رواجی فکر اور اس روایتی تعقل (Conventional wisdom) سے ٹکراتا تھا کیوں کہ انھوں نے اپنے مقالہ میں یہ لکھا تھا کہ آزاد معیشت بے قید معیشت کا نام نہیں ہے۔ امریکی دستور کے مطابق، حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ منصوبہ بند اقتصادیات (Planned economy) کا طریقہ اپنائے۔ اور حسب ضرورت نجی اقتصادی سرگرمیوں پر پابندی لگائے۔

مسٹر بورگن نے ڈاکٹریٹ سے مایوس ہو کر بزنس شروع کر دی۔ انھوں نے اپنے مقالہ کو لوہے کے ایک بکس میں بند کر دیا جو ایک تلخ وراثت (Bitter legacy) کے طور پر ان کے گھر میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ مسٹر بورگن کی عمر ۷۷ سال ہو گئی۔ وہ جسمانی اعتبار سے معذور ہو گیے۔

بالآخر حالات بدلے۔ امریکی دستور کے بارے میں نئی تعبیر عام طور پر تسلیم کی جانے لگی۔ چنانچہ امریکہ کے ایک ممتاز پروفیسر شیلی سنگر (Arthur Schlesinger Jr.) نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام امریکی تاریخ کا اتار چڑھاؤ (Cycles of American History) ہے۔ مسٹر بورگن نے یہ کتاب پڑھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ اس کتاب میں بھی وہی خیالات پیش کیے گیے ہیں جو انھوں نے تقریباً آدھی صدی قبل تحریر کیے تھے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد انھوں نے پروفیسر شیلی سنگر کو اپنے مقالہ کا خلاصہ روانہ کیا اور اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا وہ بھی انھیں تحریر کیا۔

پروفیسر شیلی سنگر (سٹی یونیورسٹی آف نیویارک) نے مقالہ کو پڑھ کر اس کی زبردست تحسین

کی۔ انھوں نے لکھا کہ مسٹر بورگن جدید اقتصادی تنظیم کے حقیقی پانیر (True pioneer) ہیں۔ مسٹر بورگن کے علاوہ انھوں نے شکاگو یونیورسٹی کے پولیٹکل سائنس ڈپارٹمنٹ کو بھی خط لکھا اور اس میں پرزور طور پر یہ اپیل کی کہ مسٹر بورگن کے معاملہ پر ازسر نو غور کیا جائے۔ کیوں کہ مسٹر بورگن نے ممتاز طور پر ایک تحقیقی کام کیا تھا اور انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ دے کر ان کے ساتھ زبردست ناانصافی ہوئی ہے۔

امریکہ میں اب آدم اسمتھ کے فکری غلبہ کا سابقہ دور ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ شیل سنگر کی اپیل کارگر ہوئی۔ یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے معاملہ پر ازسرنو غور کرنے کے بعد اقرار کیا کہ اس معاملہ میں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ مسٹر پریشٹ (Mr. Pritchett) نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مسٹر بورگن کا کام ایک عظیم کام تھا:

I thought it was a tremendous job.

چنانچہ یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ جون ۱۹۸۸ میں ایک خصوصی تقریب کی جائے اور اس میں فرینک بورگن کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی جائے۔ مزید یہ کہ شکاگو یونیورسٹی نے مسٹر بورگن کے پورے خاندان کے لیے ہوائی سفر کا انتظام اپنے ذمہ لیا تاکہ مسٹر بورگن کے ساتھ ان کی بیوی، بچے اور پوتے پوتیاں بھی شکاگو آئیں اور جون کے کانوکیشن میں شرکت کر سکیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۷ اپریل ۱۹۸۸)

جو واقعہ مسٹر فرینک بورگن کے ساتھ پیش آیا، وہی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس دنیا میں ان افراد کے ساتھ پیش آتا ہے جو خالص حق پر قائم ہونے کی کوشش کریں اور لوگوں کے سامنے بے آمیز سچائی کو پیش کرنا چاہتے ہوں۔ دنیا کے وہ لوگ جن کا دین ذاتی مفاد ہے، جو مصلحتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ انھیں رد کر دیتے ہیں۔ وہ ان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہی پچھلے پیغمبروں کے ساتھ پیش آیا اور یہی موجودہ زمانہ کے علمبرداران حق کے ساتھ پیش آئے گا۔

مگر ناقدری اور بے اعترافی کا یہ ماحول "۴۵ سال" سے زیادہ باقی رہنے والا نہیں۔ یہ صورت حال عارضی ہے نہ کہ مستقل۔ وہ وقت لازماً آنے والا ہے جب کہ حالات مکمل طور پر بدل جائیں۔ جب مالک کائنات براہ راست ظاہر ہو کر یہ اعلان کرے کہ میرے جس بندے کو انسانوں

نے رد کر دیا تھا، اس کو میں قبولیت کا شرف عطا کرتا ہوں۔ میرا یہی بندہ میرا مطلوب بندہ تھا۔ دوسرے لوگ اگر چھلکا ہیں تو یہ مغز تھا۔ دوسرے لوگ اگر کوڑا ہیں تو یہ اثاثہ تھا۔

لوگوں کے اس مردود بندے کو آج میں اپنے مقبول بندے کے طور پر سرفراز کرتا ہوں۔ آج میں اس کے لیے ابدی انعامات کے تمام دروازے کھولتا ہوں، وہ جس دروازے سے چاہے میری رحمتوں کی دنیا میں داخل ہو جائے ——— اس آنے والے دن کا آنا یقینی ہے۔ اس دن مایوسی اور ناکامی رد کرنے والوں کے لیے ہوگی، اور عزت اور کامیابی ان کے لیے جنھیں رد کر دیا گیا تھا۔

یہی بات حضرت مسیح نے ان لفظوں میں کہی ہے کہ "بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول" (مرقس ۱۰ : ۳۱) دوسری جگہ حضرت مسیح کا ارشاد اس طرح نقل کیا گیا ہے :

پھر اس نے اپنے شاگردوں کی طرف نظر کر کے کہا مبارک ہو تم جو غریب ہو، کیوں کہ خدا کی بادشاہی تمہاری ہے۔ مبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو، کیوں کہ آسودہ ہو گے۔ مبارک ہو تم جو اب روتے ہو، کیوں کہ ہنسو گے۔ جب ابن آدم کے سبب سے لوگ تم سے عداوت رکھیں گے اور تمہیں خارج کر دیں گے اور لعن طعن کریں گے اور تمہارا نام برا جان کر کاٹ دیں گے تو تم مبارک ہو گے۔ اس دن خوش ہونا اور خوشی کے مارے اچھلنا۔ اس لیے کہ دیکھو، آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔ کیوں کہ ان کے باپ دادا نبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مگر افسوس تم پر جو دولت مند ہو، کیونکہ تم اپنی تسلی پا چکے۔ افسوس تم پر جو اب سیر ہو، کیوں کہ بھوکے ہو گے۔ افسوس تم پر جو اب ہنستے ہو کیوں کہ ماتم کرو گے اور روؤ گے۔ افسوس تم پر جب سب لوگ تمہیں بھلا کہیں، کیوں کہ ان کے باپ دادا جھوٹے نبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (لوقا ۶ : ۲۰-۲۶)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ

عمارت ڈھ گئی

۳ مئی ۱۹۸۸ کو دہلی کے اخبارات کے صفحہ اول پر ایک دردناک تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ایک عمارت زمین پر گر کر کھنڈر ہو گئی۔ تصویر کے ساتھ جلی الفاظ میں لکھا ہوا تھا ـــــــ جموں اسپتال کی عمارت منہدم :

Jammu hospital collapsed

قصہ یہ ہے کہ جموں میں سرکاری فنڈ سے بچوں کا ایک اسپتال بنایا گیا۔ اس کی تین منزلہ عمارت صرف تین سال پہلے ۱۹۸۵ میں بن کر تیار ہوئی تھی۔ اب اس میں باضابطہ کام شروع ہو گیا تھا۔ اچانک اس کے ایک حصہ میں شگاف ظاہر ہوا۔ اس کے بعد رات بھر تیز بارش ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۲ مئی کو صبح ساڑھے چھ بجے یہ پختہ عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً ایک سو کی تعداد میں عملہ کے افراد، مریض اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ دب کر مر گئے۔ انڈین اکسپریس (۳ مئی ۱۹۸۸) کے مطابق خیال کیا جاتا ہے کہ انہدام کا سبب یہ تھا کہ اس میں گھٹیا قسم کا تعمیری سامان لگایا گیا تھا:

It is believed to have collapsed due to the use of inferior quality construction material.

پختہ عمارت کا یہ انہدام، اس طرح کے دوسرے واقعات کی طرح، محض ایک معمولی حادثہ نہیں۔ یہ خدا کا الارم ہے۔ یہ دنیوی واقعہ کی زبان میں آخرت میں ہونے والے واقعہ کی پیشگی اطلاع ہے۔

موجودہ دنیا میں بہت سے لوگوں کی مصلحت پرستی اور ان کی استحصالی ذہنیت انھیں یہ موقع دے رہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی شاندار عمارتیں کھڑی کریں۔ وہ اپنے چاروں طرف عظمت کی پُر بہار فصل اگائیں۔ مگر آخرت کے اعتبار سے یہ "ناقص سامان" کے اوپر اپنی تعمیر کھڑی کرنا ہے۔ موجودہ دنیا کی عمارتیں قیامت کے آتے ہی ڈھ پڑیں گی۔ لوگ دیکھیں گے کہ جہاں پہلے اونچا محل کھڑا ہوا تھا وہاں اب برباد کھنڈر کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک آیت

قرآن کی ایک آیت ہے : یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (البقرہ ۲۰۸) ایک صاحب نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے گویا کہ اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ انقلابی جھنڈے لے کر کھڑے ہو جائیں اور تمام دنیا میں اسلام کی کامل حکومت قائم کر دیں۔ مگر اس قسم کے " انقلابی مشن " کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت کا خطاب فردِ مسلم سے ہے۔ ایک ایک مسلمان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی زندگی کو خدا کے حکم پر ڈھال لو، تم پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اس آیت میں فرد کے داخلِ اطاعت ہونے کا ذکر ہے نہ کہ نظامِ حکومت کو داخلِ اطاعت کرنے کا۔

عربی میں ایک لفظ اُدْخُلُوا (پیش کے ساتھ) ہے۔ دوسرا لفظ اَدْخِلُوا (زبر کے ساتھ) ہے۔ سورۃ البقرہ (۲۰۸) میں پہلا لفظ ہے، اور سورۃ المومن (۴۶) میں دوسرا لفظ۔ اُدخلوا کے معنی ہیں داخل ہو جاؤ۔ اور اَدخِلوا کے معنی ہیں داخل کرو۔ بالفاظِ دیگر، پہلے لفظ کا خطاب اپنے آپ سے ہے، اور دوسرے لفظ کا خطاب دوسروں سے۔ سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں اُدخلوا (پیش کے ساتھ، نہ کہ زبر کے ساتھ) ہے۔ یعنی اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو کامل اسلام میں داخل کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خود بحیثیت ایک فرد کے پوری طرح اسلام کے اندر آجاؤ۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے : " اے ایمان والو، داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے " اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے : " اسلام کو پورا پورا قبول کرو۔ یعنی ظاہر و باطن اور عقیدہ و عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو۔ یہ نہ ہو کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی حکم تسلیم کر لو، یا کوئی عمل کرنے لگو۔ سو اس سے بدعت کا قلع قمع مقصود ہے۔ کیوں کہ بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا کسی عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شمار کر لیا جائے۔ مثلاً نماز اور روزہ جو کہ افضل عبادات ہیں، اگر بدون حکم شریعت کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے، جیسے عید کے دن عیدگاہ میں نوافل کا پڑھنا یا ہزارہ روزہ رکھنا، یہ بدعت ہوگا۔ خلاصہ ان آیات کا یہ ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو " ۔ صفحہ ۴۰

حل رخی پالیسی

موجودہ سال کا غالباً سب سے زیادہ اہم واقعہ سوویت روس اور امریکہ کی وہ مفاہمت ہے جس کو ٹائم (۳۰ مئی ۱۹۸۸) نے بجا طور پر عظیم اتحاد (Grand compromise) کا نام دیا ہے۔ سوویت روس اور امریکہ دونوں دنیا کی سب سے بڑی طاقت (Superpowers) شمار ہوتے ہیں۔ پچھلے ۷۰ سال سے دونوں کے درمیان سخت رقابت جاری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ٹکراؤ کی پالیسی پر قائم تھے۔ دونوں ملکوں کے پریس اور میڈیا کا کام یہ تھا کہ ایک دوسرے پر الزام لگائیں اور ایک دوسرے کی مذمت کرتے رہیں۔ مگر لمبے تجربہ کے بعد، اب دونوں ٹکراؤ کے بجائے صلح کی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہتھیاروں کی دوڑ کے بجائے بات چیت کی دوڑ پر اپنی توجہ لگائے ہوئے ہیں۔ وہ رقابت کے طریقہ کو چھوڑ کر مفاہمت کے طریقہ کو اپنا رہے ہیں۔

سوویت روس کے ایک ذمہ دار نے اس نئی پالیسی کو حل رُخی (Solution-oriented) پالیسی کا نام دیا ہے۔ اس سے پہلے دونوں کی تمام توجہ اگر اس پر جمی ہوئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو غلط ثابت کریں تو اب انھوں نے اس قسم کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام توجہ اس پر لگا دی ہے کہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ یہ واقعہ جو سوویت روس اور امریکہ کے درمیان پیش آیا ہے، اس میں دوسری قوموں کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ موجودہ زمانہ میں اختلاف اور ٹکراؤ کی پالیسی اتنا مہنگا سودا بن چکی ہے کہ بڑی طاقتیں بھی اس کا تحمل نہ کر سکیں۔ پھر چھوٹی قومیں کیوں کر اس تباہ کن مشغلہ کا تحمل کر سکتی ہیں۔

حقیقت پسندی کی طرف

نکیتا خروشچوف ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۴ تک سوویت روس کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے سرمایہ دار دنیا کو خطاب کرتے ہوئے اپنا مشہور جملہ (ہندستان ٹائمس ۲۸ جون ۱۹۸۸) کہا تھا کہ ہم تم کو دفن کر دیں گے :

We will bury you.

اسی طرح امریکہ کے پریذیڈنٹ رونالڈ ریگن نے ۱۹۸۳ میں سوویت روس کو شیطانی سلطنت (The evil empire) قرار دیا تھا۔ امریکی افسروں کا کہنا تھا کہ ہم اشتراکی روس کو سمندر میں دھکیل

دیں گے۔ مگر اشتراکی انقلاب کے ستر سال بعد ۱۹۸۸ میں آخر کار دونوں ملکوں کو اپنا ذہن بدلنا پڑا۔ روس کے لیڈروں نے گفت وشنید کے لیے امریکہ جانا شروع کیا۔ رونالڈ ریگن نے خود ماسکو کا دورہ (۲۸ جون تا ۲ جولائی ۱۹۸۸) کیا جس کو وہ اس سے پہلے خارج از امکان سمجھتے تھے۔ دورے سے پہلے واشنگٹن (ہندستان ٹائمس ۲۶ مئی ۱۹۸۸) میں انھوں نے کہا کہ ماسکو کے ساتھ امریکہ کا تعلق حقیقت پسندی کے تحت قائم ہونا چاہیے:

U.S. relations with Moscow must be guided by realism.

چالیس سال سے دونوں ملکوں کے درمیان ہتھیاروں کی دوڑ (Arms race) جاری تھی۔ دونوں ملک ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لیے تاریخ کے خطرناک ترین ہتھیار بنانے میں مشغول تھے، مگر آج وہ اپنے بنائے ہوئے ہتھیاروں پر خود ہی پابندی لگا رہے ہیں، حتی کہ اس کو ضائع کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۳ اگست ۱۹۸۸) سکشن ۲ صفحہ ۱ پر ایک خبر ہے جس کی سرخی یہ ہے:

USSR destroys 4 missiles

(سوویت روس اپنے چار میزائل کو برباد کرتا ہے) خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۲ اگست ۱۹۸۸ کو سوویت روس نے سریوزیک (Saryozek) میں چار چھوٹی رینج کے میزائل (OTR-22) برباد کردیے۔ یہ واقعہ مختلف ملکوں کے مشاہدین کی موجودگی میں ہوا جن میں ہندستان اور امریکہ کے مشاہدین بھی شامل تھے۔ میزائل کے خاتمہ کا یہ عمل اس معاہدہ کے تحت کیا گیا ہے جو ریگن اور گوربا چوف کے درمیان ہوا ہے۔

معاہدہ کے تحت سوویت روس اگلے تین سال میں اپنے ۱۷۵۲ میزائل کو ضائع کرے گا جن کا رینج ۵۰۰ کیلومیٹر سے لے کر ۵۵۰۰ کیلومیٹر تک ہے۔ امریکہ، حسب معاہدہ اپنے اسی قسم کے ۸۵۹ میزائل کو ضائع کرے گا۔

روس اور امریکہ کی پالیسی میں اس ڈرامائی تبدیلی کا راز یہ ہے کہ ہتھیار سازی اور عسکری فوقیت حاصل کرنے کی کوشش میں دونوں ملکوں کی ترقی رک گئی۔ ایک دوسرے کے خلاف ہتھیاروں کی دوڑ (Arms race) اور ایک دوسرے کے خلاف مذمت رخی (Blame-oriented) پالیسی میں نصف صدی کی مدت گزارنے کے بعد ان پر کھلا کہ اس منفی طریق کار سے وہ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ

حاصل نہ کرسکے ۔ جب کہ دوسرے کی کاٹ کی کوشش میں دونوں نے خود اپنے آپ کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا۔ چنانچہ اب انھوں نے سابقہ پالیسی کو ترک کرکے حل رخی (Solution-oriented) پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔

امریکہ اور روس

امریکہ نے اپنی ساری طاقت جنگی مشین تیار کرنے میں لگا دی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اقتصادی میدان میں خود اپنے مفتوحہ ملک جاپان سے بھی پیچھے ہوگیا۔ امریکہ آج سب سے بڑا قرض دار ملک ہے ۔ اس کے اوپر ۴۰۰ بلین ڈالر کا خارجی قرضہ ہے ، جب کہ جاپان آج سب سے بڑا دائن ملک ہے ۔ اُس نے دنیا کو ۲۴۰ بلین ڈالر قرض دے رکھا ہے ۔ امریکی ڈالر جو پچھلی نصف صدی سے اقتصادی دنیا کا شہنشاہ بنا ہوا تھا ، اس کی یہ حیثیت بری طرح مجروح ہو گئی ۔ حتیٰ کہ یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ کیا امریکہ اپنی بڑی طاقت کی حیثیت (Superpower status) کو برقرار رکھ سکتا ہے (تفصیل کے لیے : ٹائم ۴ جولائی ۱۹۸۸)

ڈاکٹر ہنری کسنجر نے ایک انٹرویو (ٹائمس آف انڈیا ۹ اگست ۱۹۸۸) میں کہا کہ نئی بنیادی حقیقت یہ ہے کہ عالمی سطح پر کچھ نئی طاقتیں ابھری ہیں۔ مثلاً چین اور ہندستان ۔ جاپان دن بدن زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہوتا جا رہا ہے ۔ ایسی حالت میں امریکہ کو دوسرے ملکوں کو نظر انداز کرنے کی پالیسی کو چھوڑنا پڑے گا ۔ امریکہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے طاقتی مراکز کے ساتھ موافقت کرے :

US will have to adjust with new power centres.

۱۹ ویں آل سوویٹ پارٹی کانفرنس جون ۱۹۸۸ کے آخری ہفتہ میں ماسکو میں ہوئی جس میں پورے ملک سے پانچ ہزار ڈیلی گیٹ شریک ہوئے ۔ اس موقع پر روسی وزیر اعظم گورباچوف نے ساڑھے تین گھنٹہ کی تقریر کی ۔ اس طویل تقریر میں انھوں نے نہایت شدت کے ساتھ خود تنقیدی (Self-criticism) کی وکالت کی ۔ ان کی اس تقریر کا ملخص متن ٹائمس آف انڈیا (۲۹ جون ۱۹۸۸ صفحہ ۱۱) پر دیکھا جاسکتا ہے ۔

مسٹر کوئنٹن پیل (Quentin Peel) ایک اخبار نویس کی حیثیت سے خود ماسکو کی اس کانفرنس میں شریک تھے ۔ انھوں نے روسی لیڈروں کی تقریریں سنیں اور ان سے ملاقاتیں کیں۔

انھوں نے روسی وزیر اعظم مسٹر گورباچوف کی ساڑھے تین گھنٹہ کی تقریر کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے :

> The message seemed plain enough: the party would have to renounce its stifling role in the administration and economy of the country. Power and privilege would have to be curbed, science and initiative given their head, if the Soviet Union were to compete with the rest of the world, let alone be a superpower.

پیغام بظاہر بالکل سادہ تھا۔ کیونسٹ پارٹی کو انتظامیہ اور اقتصادیات اور ملک کے اوپر اپنے سخت کنٹرول کو چھوڑنا ہوگا۔ طاقت اور استحقاق پر پابندی لگانی ہوگی۔ سائنس اور محرک کو آگے بڑھانا ہوگا، اگر سوویت یونین کو بقیہ دنیا کا مقابلہ کرنا ہے، سپر پاور کی حیثیت کو باقی رکھنا تو درکنار۔

پرسترائیکا

ان حالات نے روسی وزیر اعظم مسٹر میخائیل گورباچوف کو مجبور کیا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کریں۔ انھوں نے اشتراکی برتری کا مزاج ترک کرتے ہوئے روس میں تبدیلیاں لانے کی ایک نئی مہم شروع کردی جس کو وہ دو لفظ میں بیان کرتے ہیں۔ ایک گلاس ناسٹ (Glasnost) یہ ایک روسی لفظ ہے جس کے معنی کشادگی (Openness) کے ہیں۔ دوسرے، پرسترائیکا (Perestroika) اس کا مطلب روسی زبان میں تنظیم نو (Re-structuring) ہوتا ہے۔ پرسترائیکا کے نام سے مسٹر گورباچوف کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ جس کا نام انگریزی میں اس طرح ہے :

Perestroika: New Thinking for our Country and the World.

اس تحریک کے تحت روس کے سابق اشتراکی ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔ اس میں مذہبی آزادی سے لے کر اپنے روایتی دشمن امریکہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تک شامل ہیں اس سلسلہ میں نہایت سبق آموز رپورٹیں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک رپورٹ وہ ہے جو لاس اینجلس اور واشنگٹن پوسٹ نیوز سروس کے تحت اخبارات میں آئی ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۶ جنوری ۱۹۸۸) نے اس کو مسٹر رائے گٹ مین (Roy Gutman) کے نام سے شائع کیا ہے اس کا عنوان حسب ذیل ہے :

Kremlin, White House now realistic (p. 20).

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حالیہ واقعات کے بعد روس اور امریکہ کے تعلقات میں ایک

Kremlin, White House Now Realistic

By Roy Gutman

MOSCOW: A high Soviet official, ascribing a dramatic change in approach to the Reagan Administration, says US policy-makers now constitute a pragmatic "team" that is "solution-oriented" and can work well with Mr. Mikhail S. Gorbachev's new foreign policy.

"You have realistically-minded people on both sides at the moment, in the Kremlin and in the White House. That team and our team ... are solution-oriented," said Mr. Bessmertnykh, who oversees Soviet relations with the United States.

Mr. Bessmertnykh, a veteran diplomat who served 12 years in the United States and is known as a leading exponent of pragmatism, emphasised that the summit affirmed a historic shift in US-Soviet relations.

He asserted that an agreement on a treaty sharply cutting offensive nuclear arms is still possible this year, despite a number of unresolved issues.

Mr Bessmertnykh also claimed that Mr Gorbachev's new offer on conventional forces was "the most practical offer ever made." Under the offer, NATO and the Warsaw Pact would exchange data on each over's forces, verify the data on-site and reduce deployments where one side had superiority. He said Mr Reagan was non-committal, but Mr. Bessmertnykh urged the United States to give the idea serious consideration.

Mr Bessmertnykh said changed attitudes on both sides had facilitated progress toward settling, regional disputes where the United States and Soviet Union had been an influence. These disputes involve such places as Afghanistan, the Middle East, the Persian Gulf, Southern Africa and Kampuchea. In the Soviet Union, the attitude change encompasses Mr Gorbachev's "new thinking" in foreign policy, which calls for political solutions based on a "balance of interests" of all the involved parties, and in the United States, a readiness by the Reagan Administration to discuss issues on this basis.

When Mr Reagan came to office, the Administration used phrases such as "we shall draw the line, we shall go to the source, we shall stop the advance of communism..."

But eight years later, "look at the situation", he said, "the fleet was concentrated in the Persian Gulf. What was the result?" Mr Bessmertnykh said, "Practical minded people" in the administration "realise the world has changed. You can't do it any more that way. "It's impossible."

Just three years ago, when Mr Reagan and Mr. Gorbachev met in Geneva at their first summit, the US aim in the Middle East was "pushing the Soviet Union into the sea from the Middle East," he said. The Administration has dropped this "arrogant but very unrealistic policy," Bessmertnykh said.

(The Los Angeles Times Washington Post News Service).

تاریخی تغیر (Historic shift) آیا ہے۔ دونوں ملکوں میں نئی سوچ (New thinking) پیدا ہوئی ہے۔ کریملن اور وہائٹ ہاؤس دونوں ایک دوسرے کے معاملہ میں حقیقت پسند بن رہے ہیں۔ یہ رپورٹ ہم یہاں علحدہ صفحہ پر نقل کر رہے ہیں۔

روس کے ڈپٹی وزیر خارجہ (Alexander Bessmertnykh) جو اپنے ملک کے سفیر کی حیثیت سے ۱۲ سال تک امریکہ میں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے نیوز ڈے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں میں نئی سوچ (New thinking) پیدا ہوئی ہے۔ دونوں کے تعلقات میں ڈرامائی تبدیلی (Dramatic change) اور تاریخی فرق (Historic shift) آرہا ہے۔ امریکی ذمہ دار اس سے پہلے کہا کرتے تھے کہ ہم کیونزم کے پھیلاؤ کو روک دیں گے، ہم ان کو سمندر میں غرق کر دیں گے۔ مگر اب انھوں نے جان لیا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اس سے پہلے دونوں ملک ایک دوسرے کی مذمت کرنے اور ایک دوسرے کی کاٹ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ مگر یہ پالیسی سراسر بے فائدہ رہی۔ اب دونوں طرف کے لوگ حقیقت پسند بن رہے ہیں۔ اب ہماری ٹیم اور ان کی ٹیم دونوں حل رخی ذہن رکھنے والے ہیں:

That team and our team are solution-oriented..

پرسترؤئیکا کے مقاصد اور نشانے کیا ہیں، اس کی وضاحت مسٹر گورباچوف نے مخصوص اشتراکی زبان میں اس طرح کی ہے: "اور زیادہ جمہوریت، اور زیادہ سوشلزم، محنت کش انسان کے لیے اور زیادہ بہتر زندگی، قوم کے لیے اور زیادہ عظمت ورفعت اور ثروت" مگر حقیقت یہ ہے کہ "پرسترؤئیکا" سوشلزم سے واپسی ہے نہ کہ سوشلزم کی طرف "اگلا قدم"۔ کیوں کہ مارکس اور لینن کی تشریح کے مطابق، سوشلزم کی ترقی سرمایہ داری کی موت پر ہونے والی تھی۔ سوشلزم کی ہر پیش قدمی سرمایہ دارانہ نظام کی پسپائی کے ہم معنی تھی۔ مگر آج سوویت روس، گورباچوف کی قیادت میں، سرمایہ دارانہ نظام سے مفاہمت کر رہا ہے، بلکہ وہ اس کی قدروں کو اپنے یہاں رائج کرنے میں ترقی اور خوش حالی کا خواب دیکھ رہا ہے۔

پرسترؤئیکا سوشلزم کے اصولوں کی صداقت کا ثبوت نہیں ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دنیا میں کامیابی حقیقتوں کے اعتراف کے بغیر ممکن نہیں۔ ریگن کے الفاظ میں، اس زمین پر ہمیں تمام اچھے اور برے لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ حقیقت پسندی اور مفاہمت ہی اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔

نتیجہ بحث

روس اور امریکہ کے تعلقات میں یہ تبدیلی بلاشبہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ جدید تاریخ کے اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ واقعہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ٹکراؤ کی پالیسی آخری حد تک اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ اپنے حریف پر الزام لگانا، اس کی کاٹ میں لگے رہنا، اس کے ساتھ مقابلہ آرائی کرنا، روس اور امریکہ جیسی طاقتوں کے لیے بھی سراسر بے فائدہ ہے، کجاکہ دوسری کمزور قومیں اس قسم کی منفی پالیسی اختیار کر کے کسی واقعی نتیجہ کی امید کر سکیں۔

خواہ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ، دونوں کے لیے مسئلہ کا حل اسی طریق کار میں ہے۔ اس دنیا میں عقلمندی یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی تخریب کرنے کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ جائے۔ مسئلہ کو لے کر اس کے نام پر چیخ پکار کرنا یا حریف کے مقابلہ میں لڑائی چھیڑنا، صرف اپنے وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے۔ اس کے سوا اس کا اور کوئی انجام نہیں۔ ایک لفظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی اور کامیابی کا راز حل رخی (Solution-oriented) پالیسی میں ہے نہ کہ مذمت رخی (Blame-oriented) پالیسی میں۔

حاکم نہیں داعی

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک قسم کے جنونِ عظمت (Paranoia) کا کیس ہے۔ جنونِ عظمت (پیرانوئیا) کا مطلب بڑائی کا فریب (Delusions of grandeur) ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس میں وہ شخص مبتلا ہو جاتا ہے جو بطور خود اپنے کو بڑا سمجھے، جب کہ دوسرے لوگ اس کی بڑائی کو نہ مانتے ہوں۔ ایسا آدمی جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں سے نفرت کرتا ہے اور ان سے لڑتا رہتا ہے، کیوں کہ اس کو دوسروں سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ انھوں نے اس کی برتر حیثیت کا اعتراف نہیں کیا۔

" جنونِ عظمت " کے معاملہ کو ایک سادہ مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مثال اس عام منظر کی ہے جو ساس اور بہو کے مسئلہ کی صورت میں ہر گھر میں پایا جاتا ہے۔ ایک عورت کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ اس کو محبت کے ساتھ پالتی ہے۔ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر اس کو بڑا کرتی ہے۔ اس کے بعد نہایت شوق کے ساتھ اس کی شادی کرتی ہے۔ مگر جب ایک لڑکی بہو بن کر اس کے گھر میں رہنے لگتی ہے تو دھیرے دھیرے وہ اس سے متنفر ہو جاتی ہے۔ وہ بات بات میں اس سے لڑتی ہے۔ حتی کہ گھر کی فضا اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ نہ ساس کو چین رہتا ہے اور نہ بیٹے اور بہو کو۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہو کے آنے سے پہلے یہ " ساس " گھر کی مالک اور حاکم بنی ہوئی تھی۔ ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا تھا۔ مگر بہو کی آمد کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ گھر کے اندر بہو کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے۔ بیٹا پہلے اپنی تنخواہ ماں کو دیتا تھا، اب نئے انتظام کار کی حیثیت سے وہ اپنی تنخواہ " بہو " کے ہاتھ میں دینے لگتا ہے۔ پہلے ہر کام میں صرف ماں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اب بدلے ہوئے حالات کے تحت بہو سے مشورہ لیا جانے لگتا ہے۔ وغیرہ

" ساس " اس تبدیلی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ (Adjust) نہیں کر پاتی۔ ساس کو اگرچہ کوئی حقیقی تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ اکثر اوقات اس کو پہلے سے زیادہ آرام حاصل رہتا ہے۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ سمجھنے لگتی ہے کہ جس گھر میں اب تک میں حاکم کی حیثیت رکھتی تھی، وہاں بہو نے آکر مجھ کو محکوم بنا دیا ہے —— وہ چیز جس کو عام طور پر " ساس بہو کا جھگڑا " کہا جاتا ہے، وہ ساس کی نسبت

سے اسی بدلی ہوئی صورت حال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کرسکنے کا دوسرا نام ہے۔

یہی معاملہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔ جس دنیا میں وہ "ماں" بن کر رہ رہے تھے، اچانک انھیں محسوس ہوا کہ وہ اس دنیا میں "ساس" بنا دیئے گیے ہیں۔ یہ تبدیلی بذات خود کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ ایک فطری صورت حال تھی جو خود خداوند عالم کے قانون کے تحت پیش آئی۔ مگر مسلمان چوں کہ اس تبدیلی کے ساتھ ذہنی موافقت نہ کرسکے اس لیے نئے نظام میں وہ "اپوزیشن" کا کردار ادا کرنے والے، یا صحیح تر لفظ میں پیرانوئک کیرکٹر (Paranoic character) بن کر رہ گیے۔

جس زمانہ میں بابری مسجد تحریک کی دھوم تھی، میں نے ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ وسیع مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ امام صاحب نے حسب معمول عربی خطبہ سے پہلے اردو میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے "شاعر اسلام" کے بلند بانگ اشعار سنائے، اور "اکابر ملت" کے شاندار فرمودات نقل کیے۔ اور پھر پُرجوش طور پر کہا:

یہ بُت پرست ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں، ہم نے ایک ہزار سال تک ان کے اوپر حکومت کی ہے

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ ان کا مسئلہ کسی دوسرے کے ظلم کا مسئلہ نہیں، ان کا مسئلہ دراصل وہ غلط ذہن ہے جو ان کے اپنے رہنماؤں نے ان کے اندر پیدا کیا ہے۔ مسلمان داعی الی اللہ ہیں۔ مسلمانوں کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کے اندر داعیانہ نفسیات کو ابھارا جائے۔ مگر ہمارے رہنماؤں نے انتہائی مجرمانہ طور پر یہ کیا کہ انھوں نے مسلمانوں کے اندر حاکمانہ نفسیات کو ابھارا۔ اسی غلط رہنمائی کا نتیجہ وہ سب چیزیں ہیں جن کو آج ہم مسلمانوں کی بربادی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف مغل سلطنت ٹوٹی۔ دوسری طرف عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد بے شمار لوگ مسلمانوں کو رہنمائی دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ان تمام لوگوں نے ایک ہی مشترک غلطی کی۔ ان میں سے کسی شخص نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں صورت حال کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کے مطابق مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دے۔ ہر ایک نے بس یہ کیا کہ ایک یا دوسرے انداز میں ماضی کی سیاسی کہانیاں سنانے لگا۔ ہر ایک کے پیغام کا خلاصہ وہی تھا جو ان کی تقلید میں

مسجد کے امام نے دہرایا : ہم ہزار سال تک دنیا کے حکمراں رہے ہیں۔ اور ہم ہی ہیں جس کو دوبارہ دنیا کے سیاسی تخت پر بیٹھنا ہے۔

بات یہیں تک نہیں رہی۔ کچھ شاعر اور خطیب قسم کے لوگوں نے مزید آگے بڑھ کر یہ اعلان کر دیا کہ ——— "ہم محتسب کائنات ہیں، ہمارا منصب ساری کائنات کا احتساب کرنا ہے"۔ یہ بات بلاشبہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے۔ کیوں کہ "محتسب کائنات" اگر کوئی منصب ہے تو وہ صرف خالق ومالک کے لیے سزاوار ہے۔ یہ صرف اللہ عزوجل ہے جو اگر چاہے تو کائنات ارض وسما کا احتساب کرے۔ اس کے سوا کسی کے پاس نہ اس کی طاقت ہے اور نہ کسی کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔

اس بنا پر اس غیر عقلی اور غیر اسلامی نظریہ کے لیے خدا کی کتاب میں کوئی دلیل نہیں مل سکتی تھی۔ یہاں رہناؤں کی شاعرانہ تخئیل نے کام کیا۔ چنانچہ ابلیس کی ایک خیالی مجلس شوریٰ منعقد کی گئی اور اس کی فرضی روداد مرتب کر کے ابلیس کی زبان سے اس "حقیقت" کا اعلان کر دیا گیا کہ :

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ "حقیقت" کا ماخذ خدا ورسول کے کلام میں کہیں موجود نہیں۔ اور اگر کسی صاحب کے نزدیک موجود ہو تو وہ مجھے ایسی آیت یا حدیث لکھ کر بھیج دیں جس میں یہ "حقیقت" بیان کی گئی ہے کہ مسلمان محتسب کائنات ہیں۔

مزید یہ کہ اس کو خود ابلیس کا کلام بھی نہیں کہا جا سکتا۔ فن روایت کے مطابق اس میں یہ نقص ہے کہ ابلیس سے راوی کی ملاقات ثابت نہیں۔ اس بنا پر دینی معاملہ میں اس کا حوالہ قطعی غیر معتبر ہے۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود یہ غیر ثابت شدہ کلام ابلیس اتنا پھیلا کہ بڑے بڑے بزرگ اور اکابر اس کو حقیقت واقعہ سمجھ کر دہرانے لگے۔ بلکہ مسلمانوں کے "مقام ومنصب اور ان کی صحیح حیثیت" کو بتانے کے لیے اس کا حوالہ اس طرح دیا جانے لگا گویا اس کو آخری سند کا درجہ حاصل ہو (تعمیر حیات، ۱۰ اگست ۱۹۸۸)

کیسا عجیب ہوگا امت مسلمہ کا وہ اسلامی منصب جو قرآن وحدیث میں تو نہ بتایا گیا ہو، البتہ ابلیس کے مفروضہ کلام سے حیرت انگیز طور پر اس کو برآمد کر لیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان انھیں غلط رہنمائیوں کے وارث ہیں۔ ان کا ذہن اپنے نام نہاد رہناؤں کے شاعرانہ اور خطیبانہ اور انشاپردازانہ کلام سے بنا ہے نہ کہ حقیقۃً خدا ورسول کے سچے کلام سے۔ اس

چیز نے ان کے ذہن و فکر کو لغویت کی حد تک غیر حقیقی بنا دیا ہے جس کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ حاکمانہ نفسیات میں جینے والی ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں، جب کہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ داعیانہ نفسیات میں جینے والی قوم بنتے۔

اب پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اس غلط اور غیر حقیقی ذہن کی اصلاح کی جائے۔ جب تک مزاجی اصلاح کا یہ کام نہ ہو، نہ کوئی دوسرا اعلیٰ کام صحیح طور پر کیا جا سکتا اور نہ مسلمانوں کے مستقبل کو بدلا جا سکتا۔ کوئی شخص عام پسند نعرہ دے کر وقتی طور پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کر سکتا ہے۔ مگر فکری اصلاح سے پہلے کوئی حقیقی انقلاب اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ بیج کے بغیر درخت کا وجود میں آنا۔ بلا تشبیہ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تاجر کے اندر اگر داداگیری کا مزاج پیدا ہو جائے تو سب سے پہلے اس کے اس مزاج کی اصلاح کی جائے گی۔ کیوں کہ تجارت کا کام تاجرانہ مزاج کے ساتھ کیا جا سکتا ہے نہ کہ داداگیری کے مزاج کے ساتھ۔

مسلمان، قرآن کے الفاظ میں، مذکّر (نصیحت کرنے والے) ہیں۔ وہ دوسری قوموں کے اوپر مُصیطِر (داروغہ) نہیں ہیں (۸۸ : ۲۲) مسلمان اس دنیا میں حاکم نہیں ہیں بلکہ داعی ہیں۔ وہ سلطان نہیں بلکہ سفیر ہیں۔ وہ دنیا کے جج نہیں ہیں بلکہ دنیا کے ناصح ہیں۔ انھیں دو لفظوں پر غور کر کے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآنی ذہن کیا ہے اور مسلم رہنماؤں کا پیدا کردہ ذہن کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ماضی میں مسلمانوں کو بہت سی چیزیں دی گئیں۔ جن میں غلبہ واقتدار بھی شامل تھا۔ مگر وہ خدا کا عطا کردہ تھا نہ کہ مسلمانوں کا اپنا حاصل کردہ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ان چیزوں کی حیثیت انعام کی ہے نہ کہ نشانہ کی۔ مسلمان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کی پیغام رسانی کرے اور اس کے سوا تمام چیزوں کو اللہ کے خانہ میں ڈال دے۔ کیوں کہ وہی جس کو چاہے جو چیز دے اور جس سے چاہے جو چیز چھین لے۔

مسلمانوں نے جب اپنی برتر حیثیت کو کھویا، اس وقت اگر وہ اس کے سبب پر غور کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اپنا داعیانہ کردار کھونے کی وجہ سے ان پر یہ افتاد پڑی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی ساری کوشش داعیانہ ذمہ داری کو ادا کرنے میں لگا دیتے اور اس طرح دوبارہ انعام خداوندی کے مستحق قرار پاتے۔ مگر اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نگاہیں صرف ظاہری واقعہ پر اٹک کر رہ گئیں۔ انھیں واقعہ نظر آیا مگر سببِ واقعہ انھیں دکھائی نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان قوموں کے خلاف شکایت

اور احتجاج اور ٹکراؤ میں مشغول ہو گیے جن کو وہ غلط طور پر اپنے المیہ کا ذمہ دار سمجھتے تھے ۔ وہ خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انسان کی طرف متوجہ ہو گیے ——— انھیں دو لفظوں میں موجودہ دور کے مسلمانوں کے المیہ کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما ایک انتہائی خطرناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ وہ یہ کہ وہ صرف ——— دو اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں ——— حاکم اور محکوم ۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسری اصطلاح انھیں شعوری طور پر معلوم ہی نہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اگر " حاکم " کا درجہ نہ دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں " محکوم " کا درجہ دیا جا رہا ہے ۔ اسی غلط فکری کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے دینی منصب کو حاکم کی اصطلاح میں بیان نہ کرے تو وہ فوراً اس پر الزام لگانے لگتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو محکوم اور مغلوب بنا دینا چاہتا ہے ۔

مگر یہ سراسر کوتاہ فہمی کی بات ہے ۔ ان کے پاس صرف دو پیمانے ہیں ، تیسرا زیادہ اہم پیمانہ ان کے پاس موجود ہی نہیں ، اور وہ دعوت الی اللہ کا پیمانہ ہے ۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ حاکم کا تقابل محکوم سے کرنے کے بجائے حاکم کا تقابل داعی سے کریں ۔ یہ مشورہ یقیناً لغو ہوگا کہ مسلمان مغلوب اور محکوم بن کر زندگی گزاریں ۔ مگر یہ کہنا بھی اتنا ہی بے بنیاد اور لغو ہے کہ مسلمان حاکم اقوام اور محتسب کائنات بن کر رہنے کے لیے پیدا کیے گیے ہیں ۔

صحیح بات ان دونوں کے علاوہ ہے ۔ اور وہ یہ کہ مسلمان داعی ہیں ۔ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ کے سچے دین کی طرف لوگوں کو بلائیں ۔ یہ ایک خالص خدائی مشن ہے ۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو آخرت میں وہ خدا کے انعامات کے مستحق ہوں گے ۔ اور اگر خدا نے چاہا تو دنیا میں بھی وہ انھیں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا ، خواہ وہ سیاسی انعام ہو یا اور کوئی انعام ۔

کرنے کا کام

مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے اس وقت جو کام کرنا ہے، اس کو تین عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے ——— تزکیہ افراد، احیاء دعوت، اور تعمیر ملت۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ طول امد کے بعد قساوت پیدا ہو جاتی ہے (الحدید ۱۶) یعنی بعد کی نسلوں میں اسلام زندہ شعور کی سطح پر باقی نہیں رہتا بلکہ بے حسی کی سطح پر پہونچ کر ٹھہر جاتا ہے جس کا دوسرا نام جمود ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ایمان و اسلام کو دوبارہ ان کے زندہ شعور کا حصہ بنایا جائے۔ ایمان کی بجھی ہوئی راکھ کو دوبارہ بھڑکتا ہوا شعلہ بنا دیا جائے۔ اسی کو تزکیہ کہا گیا ہے۔

دوسری چیز دعوت ہے جو قرآن کے مطابق (الحج ۷۸) امت مسلمہ کا نصب العین ہے اور جس کے اوپر اس کے عزت و غلبہ کا انحصار ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس فریضہ کو فراموش کر چکے ہیں۔ آج کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں دعوت کا شعور پیدا کیا جائے اور ان کے درمیان دعوت الی اللہ کے کام کو زندہ کیا جائے۔ اس کے بغیر وہ خدا کی مدد کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

تیسری چیز تعمیر ملت ہے جس کو قرآن میں قیام (النساء ۵) اور قوت (الانفال ۶۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی مادی اسباب کی فراہمی۔ دنیوی اعتبار سے مسلمانوں کا اس قابل ہونا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں خود کفیل اور باعزت زندگی گزار سکیں۔

بدقسمتی سے ہمارے لیڈروں نے مذکورہ تینوں کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے بظاہر بہت سی تحریکیں چلائی ہیں اور چلا رہے ہیں۔ مگر یہ تمام تحریکیں قیادت کی تعمیر کرنے والی ہیں نہ کہ ملت کی تعمیر کرنے والی۔ الرسالہ کا مشن اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کا دل یہ گواہی دے کہ الرسالہ کا مشن ہی موجودہ زمانہ میں صحیح مشن ہے، ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ الرسالہ کو پھیلائیں۔ ایجنسی یا دوسرے طریقوں سے وہ اس کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کریں۔

میوات کا سفر

۱۹۶۷ میں جب میں دہلی آیا تو "میوات" کا ایک افسانوی تصور میرے ذہن میں تھا۔ یہ خواہش تھی کہ وہاں چل کر خود اپنی آنکھ سے دیکھا جائے کہ میوات کیا ہے۔ پہلی بار میں ۱۹۶۹ء میں میوات گیا اور وہاں ۴۸ گھنٹے گزارے۔ اس کے بعد اگلے دس سال کے عرصہ میں بار بار میوات کا سفر ہوتا رہا۔

اب کچھ لوگوں کا مشورہ ہوا کہ ان پچھلے سفرناموں کو اکٹھا کر کے انھیں ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ ان سفرناموں کو دوبارہ مرتب کرتے ہوئے خیال آیا کہ یہ اسفار پندرہ سال پہلے کے زمانہ میں پیش آئے تھے۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک بار اور میوات کے علاقہ کا سفر کر لیا جائے تاکہ میرا مشاہدہ مطابق حال ہو جائے۔ اس کے مطابق میوات کا زیر تذکرہ سفر ہوا۔ یہ سفر میں نے بالقصد بذریعہ بس کیا تاکہ میں عام میواتیوں کو ان کے اپنے ماحول میں دیکھ سکوں اور زیادہ قریب سے میوات کا مشاہدہ کر سکوں۔

اس سفر میں مولانا عبد الرحیم بڈیڈوی میرے ساتھ تھے۔ ان سے میں نے مقصدِ سفر کا ذکر کیا تو انھوں نے مسکرا کر کہا: "میوات میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ پندرہ سال پہلے آپ نے میوؤں کو جس حال میں دیکھا تھا، وہیں آج بھی وہ پڑے ہوئے ہیں"۔ سفر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی ان کا بیان صحیح تھا۔ میوات کے دوسرے فرقوں کے لیے زمین حرکت میں ہے مگر میوؤں کے لیے زمین بدستور رکی ہوئی ہے، میوؤں کے لیے وہ حرکت نہیں کرتی۔

ایک صاحب نے بس کا تازہ لطیفہ بتایا۔ ایک عمر رسیدہ میونی بس میں داخل ہوئی۔ وہ بس کے اندر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کہاں بیٹھے۔ ایک مسافر نے ازراہ تفریح ڈرائیور کی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھ وہ سیٹ خالی ہے، اس پر بیٹھ جا۔ میونی اپنی گٹھری لیے ہوئے وہاں پہنچی اور "خالی سیٹ" پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ "عورت تو یہاں کہاں بیٹھ گئی۔ یہاں سے تو میں بیٹھ کر گاڑی چلاؤں گا" ڈرائیور نے کہا۔ میونی نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے جواب دیا: میں تو چوکھی بیٹھی ہوں، تو کہیں اور سے چلالے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میواتی مرد یا عورتیں خدانخواستہ پیدائشی طور پر کم سمجھ ہوتے ہیں۔ وہ بھی یقیناً وہی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے انسان لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دراصل تعلیم کی کمی ہے جس کی بنا پر میوؤں کا شعور ارتقاء نہیں کر پاتا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک بوڑھی میونی بازار گئی۔ اور پچاس روپے میں ایک زنانہ جوتا خرید کر لے آئی۔ گاؤں کی عورتوں نے دیکھ کر پوچھا کہ یہ جوتا تم نے کتنے میں خریدا۔ میونی نے کہا کہ "آٹھ آنے میں" عورتوں نے کہا کہ کیوں مذاق کر رہی ہو، صحیح دام بتاؤ۔ میونی نے کہا کہ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ بات یہی ہے۔ عورتوں کو یقین نہیں آیا کہ ایسا جوتا آٹھ آنے میں مل سکتا ہے، چنانچہ وہ اصل قیمت جاننے کے لیے اصرار کرتی رہیں۔ آخر میونی نے کہا کہ بات یہ ہے کہ پہلے میں ایک سیر گھی بازار لے جاتی تھی اور آٹھ آنے میں بیچتی تھی۔ پھر آٹھ آنے کا جوتا خرید کر لاتی تھی۔ اب میں ایک سیر گھی لے کر بازار گئی تو میرا گھی پچاس روپے میں بکا اور جوتا بھی پچاس روپے میں ملا۔ تو میرے لیے تو جیسا پچاس روپیہ ویسا آٹھ آنہ۔

مذکورہ میونی نے اقتصادیات کے ایک اصول کو نہایت کامیابی کے ساتھ سادہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی قیمت کے تعین کے اصول کو۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ کی صبح کو ساڑھے چھ بجے دہلی سے بذریعہ بس روانگی ہوئی۔ شاہ جہاں آباد کی فصیلوں اور لال قلعہ کی دیواروں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہماری بس آگے بڑھتی رہی۔ فرید آباد، بلب گڑھ، پلول، ہوڈل، کوسی ہوتے ہوئے ہم کاما (ضلع بھرت پور) پہونچے۔ کاما ایک تاریخی قصبہ ہے۔ قدیم راجہ کے محل اب بھی یہاں ٹوٹی ہوئی حالت میں موجود ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے محلہ قاضی پاڑہ میں مسلمانوں کی آبادی تھی۔ تقسیم کے بعد صاحب حیثیت لوگ زیادہ تر پاکستان چلے گیے۔ اس وقت یہاں ایک جامع مسجد زیر تعمیر تھی۔ عین اسی زمانہ میں تقسیم کا ہنگامہ پیش آیا اور مسجد اس حال میں پڑی رہ گئی کہ دیواریں کھڑی ہوئی تھیں مگر چھت غائب تھی۔ صحن اور فرش کی جگہ گڑھے تھے۔ ویران مسجد جانوروں کی آماج گاہ بن گئی۔

۳۰ سال سے زیادہ عرصے کے بعد حاجی رحیم بخش کو خیال آیا کہ اس کی تعمیر کریں اور اس کو باقاعدہ آباد کریں۔ انھوں نے "آسمان کے سایہ کے نیچے" اور صرف اللہ کے بھروسہ پر کام شروع

کر دیا۔ انھوں نے مسجد کی تعمیر مکمل کی اور یہاں حفظِ قرآن کا مدرسہ قائم کیا۔ اب ماشاء اللہ یہ ایک آباد مسجد ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حافظہ کے علاوہ دوسرے علوم بھی بقدر ضرورت پڑھائے جا رہے ہیں۔ قاری عبد الرحمٰن ہزاروی اس کے روحِ رواں ہیں۔

میری فرمائش پر چند بچوں نے قرآن کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ بچے جب قرأت کے ساتھ قرآن کی آیتیں پڑھ رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ نزول قرآن سے لے کر اب تک مسلسل ہر دور میں اور رات دن کے ہر لمحہ میں امت اسی طرح قرآن کو پڑھتی اور سناتی رہی ہے۔ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے حال کا رشتہ ماضی سے مل گیا ہے، جیسے آج کے قاری قرآن کے الفاظ دورِ اول کے قاری قرآن سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ جیسے کہ یہ وہی پیغمبر عربی کی بلند کی ہوئی قدیم آواز ہے جو مجھ کو جدید نسل کی زبان سے سنائی دے رہی ہے۔

یہ وہ علاقہ ہے جہاں ۱۹۴۷ میں کافی مار کاٹ ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمان سب اِدھر اُدھر چلے گئے تھے۔ مسجد کو آباد کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان دوبارہ آکر بسنا شروع ہو گئے چنانچہ اب کافی مسلمان دوبارہ واپس آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اسی طرح دوسری قوموں کے لوگوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

کاما کی اس مسجد کے قریب ایک گوردوارہ ہے اور اس سے بالکل ملا ہوا مندر بھی ہے۔ یہاں جو بابا جی ہیں وہ روزانہ صبح کو فجر سے پہلے اپنی مذہبی ریکارڈنگ کرتے ہیں۔ مگر مسجد والوں نے بتایا کہ بابا جی ہماری عبادت کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ جیسے ہی ہمارا موذن فجر کی اذان شروع کرتا ہے، وہ فوراً اپنی ریکارڈنگ بند کر دیتے ہیں۔

بابا جی ایسا کسی مطالبہ یا احتجاج کی بنا پر نہیں کرتے۔ بلکہ محض اپنے مذہبی جذبہ کے تحت کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی اچھی بات کا احترام کرنا ایک فطری جذبہ ہے جو خود خدا نے ہر آدمی کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔ اگر انسان کو چھیڑا نہ جائے تو یہ فطری جذبہ کام کرے گا اور اپنے آپ دوسروں کے اچھے کام کے احترام کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ مگر جب ایک فریق دوسرے فریق کی انا کو جگا دے تو یہ پیدائشی جذبہ دب جاتا ہے۔ اس کے بعد انسان کی بھڑکی ہوئی انا کام کرنے لگتی ہے نہ کہ خدا کا پیدا کیا ہوا فطری جذبہ ـــــــ حقیقت یہ ہے کہ

ہر آدمی کے حصہ میں اس کے اپنے عمل کا انجام آتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کو نادانی کی بنا پر فریق ثانی کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

اس مسجد اور مدرسہ کو خوش قسمتی سے ایسے کارکن ملے ہیں جو نہایت سیدھے ہیں۔ جھگڑا لڑائی تو درکنار، وہ احتجاج کی زبانی مہم بھی چلانا نہیں جانتے۔ وہ ماحول کے ہر خوشگوار یا ناخوشگوار واقعہ سے بے خبر رہ کر بس "قرآن کی خدمت" میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سادہ مزاجی کا انھیں زبردست فائدہ ملا ہے۔

مجھے یہاں بیت الخلاء جانے کا اتفاق ہوا۔ خلاف توقع میں نے دیکھا کہ دو نہایت صاف ستھرے بیت الخلاء "فلش" کے اصول پر بنے ہوئے ہیں۔ یہ میوات میں میرے لیے نئی چیز تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں حکومت کی مدد سے بنے ہیں۔ حکومت کی طرف سے دیہات کے سرکاری اسکولوں کے لیے اس قسم کی سہولت کا اعلان کیا گیا تھا۔ مدرسہ والوں نے بھی اپنے لیے دو بیت الخلاء کی درخواست دے دی۔ درخواست منظور ہو گئی، اور یہ مسئلہ نہایت عمدہ طریقہ پر حل ہو گیا۔ اسی طرح مدرسہ والوں کی درخواست پر حکومت کے محکمہ نے یہاں بجلی اور پانی بھی پہونچا دیا ہے۔

مسجد اور مدرسہ کے کارکنوں کو دیکھئے تو وہ تقریباً بے زبان معلوم ہوں گے۔ مگر بعض حالات میں بے زبانی اس سے بھی زیادہ بڑی طاقت بن جاتی ہے جتنی کہ زباندانی۔

کاما سے دوبارہ بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ اور پہاڑی، گوپال گڑھ، سیکری وغیرہ ہوتے ہوئے گلپاڑہ پہنچے۔ راستہ میں بس چند منٹ کے لیے میل کھیڑلا کے مدرسہ پر رکی۔ یہاں میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شاندار مسجد اور مدرسہ وسیع رقبہ میں بنایا گیا ہے اور اس پر اسلامی مدرسہ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ "تعمیر" کے ان امکانات کو نہیں دیکھتے، اور صرف "تخریب" کی خبریں سناتے رہتے ہیں وہ خود سب سے بڑے تخریب کار ہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو معمار قوم کیوں نہ سمجھ رہے ہوں۔

گلپاڑہ میں بھی سڑک کے کنارے ایک بڑی جامع مسجد کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ مسجد بالکل نئی جگہ پر بنائی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں ایک مدرسہ بھی زیر تعمیر ہے۔ اس مسجد میں ہم

نے ظہر کی نماز ادا کی۔ میں نے سوچا کہ اس ملک میں اگر مسلمانوں نے کچھ کھویا ہے تو اس سے بہت زیادہ اب بھی ان کے لیے یہاں موجود ہے۔ مگر اس ملک میں مسلمانوں کی قیادت ماضی کے قائدین سے لے کر حال کے قائدین تک ایک ہی غلطی کر رہی ہے۔ اور وہ ہے بعض ناموافق حالات کی تعمیم (جنرلائزیشن)۔ ہماری قیادت کا حال یہ ہے کہ ۹۹ اچھی باتیں اس کو نظر نہیں آتیں۔ البتہ ایک خراب بات اس کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ نظر آجاتی ہے۔ اور اس کے نام پر دھوم مچا کر عام مسلمانوں کا ذہن اس طرح خراب کر دیتی ہے کہ اب مسلمانوں میں شاید وہ لوگ باقی ہی نہیں رہے جو مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز پر سوچ سکیں۔

گلپاڑہ میں مفتی عبد الشکور مظاہری (پیدائش ۱۹۴۷) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۳۹۰ھ میں وہ ایک جماعت کے ساتھ پٹن (گجرات) گیے۔ یہاں مولانا محمد طاہر پٹنی (مصنف مجمع بحار الانوار) کے خاندان کے ایک صاحب ان کو اپنے گھر لے گیے۔ ان کے پاس مخطوطات (ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں) کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ اس کو فروخت کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنا یہ ذخیرہ مختلف لوگوں کو دکھایا، مگر کوئی شخص اس کو خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر کتابوں کے سرورق غائب تھے اور بظاہر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کون سی کتاب ہے۔

مفتی عبد الشکور صاحب نے ایک کتاب اٹھائی۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں تھی۔ مگر کسی جلد پر بھی سرورق موجود نہ تھا۔ میں نے دیکھا تو چاروں نہایت عمدہ خط میں اس طرح یکساں انداز میں لکھی ہوئی تھیں جیسے کہ وہ ٹائپ میں چھاپی گئی ہوں۔

مفتی عبد الشکور صاحب نے ایک جلد اٹھائی اور کھول کر اس کا ابتدائی صفحہ پڑھنا شروع کیا۔ اس میں چند سطروں کے بعد مصنف نے اپنے اس مجموعۂ کتب کے بارے میں یہ الفاظ لکھے تھے:

وَسَمَّيْتُهَا فتح الله المعين على شرح العلامة مُلّا مِسكين

وہ چوں کہ "ملا مسکین" سے واقف تھے، انھوں نے اس جملہ سے پوری بات پالی ——— "کنز الدقائق کی شرح ملا مسکین، اور ملا مسکین کی شرح فتح اللہ المعین"۔ یہ کتاب اب

بھی نہایت عمدہ حالت میں ہے اور اس کے مصنف سید محمد ابو السعود ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دوسری کتابوں کے بارہ میں پتہ کر لیا اور خریدنے کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔ مالک نے اولاً سب کی قیمت تین ہزار روپے بتائی۔ مگر مفتی عبدالشکور صاحب کے الفاظ میں " اس وقت تین ہزار میرے لیے کالا پہاڑ کی طرح تھا "۔ آخرکار مالک نے صرف ۳۰۰ روپے میں سارا قیمتی ذخیرہ انھیں دیدیا۔ یہ کل ۶۰۰ کتابیں ہیں۔ ان میں فتاویٰ تاتارخانیہ جیسی تاریخی کتابیں بھی شامل ہیں۔

کسی حقیقت کو پانے کے لیے پیشگی طور پر اس سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ پیشگی طور پر آشنا نہ ہوں، وہ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھیں گے مگر وہ اس کو پہچان نہ سکیں گے۔

گلباڑہ کی ملاقاتوں میں ایک یادگار ملاقات حاجی دراب خاں (عمر ۸۰ سال) کی تھی۔ وہ بالکل ان پڑھ ہیں۔ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر ان کے اندر ایک ایسی خصوصیت ہے جو اپنی معلومات کے مطابق اب تک میں نے کسی عالم کے اندر بھی نہیں پائی، وہ ہے ———— اختلاف کے باوجود قدر دانی۔

مولانا عبدالرحیم صاحب (بڈبڈ، ضلع گوڑ گاؤں) اس سے پہلے گلباڑہ کے مدرسہ میں استاد تھے۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال تک امام اور مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں وہ یہاں سے چھوڑ کر چلے گیے۔ دیہات کے لوگوں کو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں میں اماموں اور مدرسوں سے شکایت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گلباڑہ کے لوگوں کو بھی ہوئی۔ انھیں میں سے ایک حاجی دراب خاں بھی تھے۔ ان کے الفاظ میں ان کی " اس مولوی سے لڑائی رہنے لگی "۔

لڑائی کس بات پر ہوتی تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر۔ مثلاً حاجی دراب خاں نے اپنا ایک درخت کٹوایا اور اس کی لکڑی مسجد کے صحن میں رکھوا دی۔ اس کی وجہ سے مسجد کا صحن تنگ ہو گیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس لکڑی کو یہاں سے ہٹاؤ۔ مگر حاجی دراب خاں نے نہیں ہٹوایا۔ آخر مولانا عبدالرحیم صاحب نے ایک روز اپنے مدرسہ کے لڑکوں کے ذریعہ تمام لکڑی کو وہاں سے نکلوا کر باہر رکھوا دیا۔ اس پر حاجی دراب خاں کافی غصہ ہوئے۔ وغیرہ

یہ مسجد حاجی دراب خاں کے خاندان نے بنوائی تھی۔ مدرسہ بھی ان ہی لوگوں نے قائم کیا تھا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب وہاں گویا ان کے ایک "ملازم" تھے۔ ایسی حالت میں ان کی یہ جسارت بالکل ناقابل برداشت تھی۔ اس قسم کی اور بہت سی باتیں تھیں جن کی وجہ سے حاجی دراب کی "اس مولوی سے لڑائی رہتی تھی" مگر مولانا عبدالرحیم نے بتایا کہ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حاجی دراب ان کے بارہ میں مخالفانہ رول ادا کریں۔

مولانا عبدالرحیم ایک بااصول آدمی ہیں اور اسی کے ساتھ صاف گو ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے لوگوں سے کسی نہ کسی بات پر ان کی تکرار ہو جاتی تھی۔ مثلاً وہ یہاں مسجد کے امام بھی تھے۔ مقرر وقت پر وہ ٹھیک گھڑی کے لحاظ سے جماعت شروع کر دیتے تھے، خواہ کوئی آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ بعض لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار ہوتی تھی۔ اس طرح کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی لوگ ان کے خلاف ہو گیے۔ حتی کہ انھوں نے گاؤں کی اکثریت کو اپنے موافق بنا لیا اور عام رائے یہ ہو گئی کہ ان کو مدرسہ سے نکال دیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے آدمی کو لایا جائے۔

مگر حاجی دراب اس تحریک کے سخت مخالف ہو گیے۔ انھوں نے کہا کہ "اگرچہ اس مولوی سے میری ذاتی لڑائی ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مدرسہ کے کام کے لیے وہ نہایت موزوں ہے، اس کو ہٹانے کے بعد ایسا لائق معلم ہم کو نہیں مل سکتا۔ اس لیے انھوں نے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی عبدالرحیم صاحب کی بھرپور حمایت کی ——— ذاتی شکایت کے باوجود اعتراف اور قدردانی کی یہ صفت اتنی کم یاب ہے کہ کم از کم میں نے اپنے تجربہ میں اب تک کوئی دوسرا حاجی دراب نہیں دیکھا۔

"حاجی دراب خاں" بظاہر ایک معمولی آدمی ہیں مگر میرے نزدیک وہ آنے والے عظیم میوات کی علامت ہیں۔ وہ میوؤں کے تاریک حال میں اس کے روشن مستقبل کو بتا رہے ہیں۔

میو قوم اگرچہ اپنی جہالت اور اپنی بے شعوری کی وجہ سے ہندستان کی ایک پچھڑی ہوئی قوم بنی ہوئی ہے۔ مگر فطری امکانات کے اعتبار سے وہ ایک جاندار قوم ہے۔ باعتبار واقعہ اگرچہ یہ دوسروں سے پیچھے ہیں۔ مگر باعتبار امکان آج بھی وہ دوسروں سے آگے ہیں۔ ذاتی شکایتوں کو نظر انداز کر کے کسی کی خوبیوں کا اعتراف کرنا، اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ حاجی دراب کی مثال

بتاتی ہے کہ یہ اعلیٰ انسانی صفت میووں کے اندر موجود ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں میووں کے لیے ایک عظیم مستقبل کا امکان چھپا ہوا ہے ۔

حاجی دراب خاں نے بتایا کہ انھوں نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو کئی بار دیکھا ہے اور ان کی تقریریں اور گفتگوئیں سنی ہیں ۔ میں نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب کی کوئی بات جو آپ کو یاد ہو بتائیے ۔ انھوں نے کہا کہ مولانا جب یہاں آئے تو انھوں نے میووں سے کہا کہ ــــــ سلوک سے رہو، نماز پڑھو اور جماعتوں میں جاؤ ۔

میں مسجد میں تھا کہ ایک میو نے دوسرے میو سے سوال کے انداز میں کہا : کرلیے اُجو (کرلیا وضو) میواتی زبان دراصل بگڑی ہوئی اردو کا دوسرا نام ہے ۔ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کا حال یہی ہے ۔ ہر ایک کی ایک ادبی اور تحریری زبان ہوتی ہے اور دوسری وہ ہے جس کو عوامی بولی کہا جاتا ہے ۔ اسی فرق کی وجہ سے ایک زبان جانتے ہوئے بھی آدمی اس ملک کے باشندوں کی باہمی گفتگو کو سمجھ نہیں پاتا ۔ کیوں کہ غیر شخص کتابی زبان جانتا ہے اور مقامی لوگ عوامی بولی میں باہم گفتگو کرتے ہیں ۔ یہ ثنویت عربی اور انگریزی جیسی زبانوں میں بھی ہے اور اردو اور ہندی جیسی زبانوں میں بھی ۔

ایک نوجوان میو سے ملاقات ہوئی ۔ اس کا ایک ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹا ہوا تھا ۔ معلوم ہوا کہ تھریشر (Thresher) میں کٹ گیا ہے ۔ جب سے تھریشر (دانہ کو بھوسہ سے الگ کرنے والی مشین) کا رواج ہوا ہے ، اس طرح کے حادثے زرعی علاقوں میں بہت زیادہ پیش آرہے ہیں ۔ بیل کا رواج کم ہوجانے کی وجہ سے لوگ تھریشر کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں ، اور موجودہ تھریشر کا حال یہ ہے کہ ذرا سی غفلت سے وہ ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور پھر اس کو کچلے بغیر نہیں رہتا ۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اب تھریشر کی جگہ کمبائن (Combine) مشین رائج ہوگئی ہے ۔ یہ دوسری مشین بہ یک وقت دو کام کرتی ہے ۔ وہ فصل کاٹتے ہوئے عین اسی وقت اس کا دانہ بھی الگ کردیتی ہے ۔

تاہم تھریشر بجائے خود کوئی مہلک چیز نہیں ، یہ ہندستانی صنعت ہے جس نے اس کو مہلک بنا دیا ہے ۔ ہندستان میں جو تھریشر بنائے جاتے ہیں وہ ایسی وضع کے ہوتے ہیں کہ ان

میں ڈالنے والی چیز کنارے سے ڈالی جاتی ہے اور اس کو ہاتھ سے دھکیلنا پڑتا ہے۔ اس بنا پر یہ خطرہ رہتا ہے کہ ہاتھ اس کے اندر چلا جائے۔ مگر یہ پرانا طریقہ ہے۔ باہر کے ملکوں میں اب ایسے تھریشر بنائے گئے ہیں جن میں کٹی ہوئی فصل کے گٹھے بنا کر اوپر سے ڈال دیتے ہیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے آٹا پیسنے والی مشین میں غلہ اوپر سے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے تھریشر میں یہ امکان ہی نہیں کہ ہاتھ کو مشین پکڑے۔

ہر سال اخباروں میں تھریشر سے ہاتھ کٹنے کی خبریں چھپتی ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ ہندستانی مشینوں کا طرز ابھی تک بدلا نہیں گیا۔

ہم لوگ بستی میں چل رہے تھے کہ ایک عورت گود میں ایک بچہ لیے ہوئے سامنے آئی۔ اس نے مولانا عبد الرحیم صاحب بڈیڈوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: میری بہن کو خون کٹ رہو ہے، اس کو نکس بنا دے (میری لڑکی کو خون کی پیچش ہو رہی ہے، اس کے لیے تعویذ لکھ دو)

میوات کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی جہالت ہے۔ یہاں کے بیشتر لوگ ناخواندہ یا نیم خواندہ ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں کی زندگی میں رسوم اور توہمات کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کے نیچے میوؤں کی پوری زندگی دب کر رہ گئی ہے۔ خاص طور پر عورتیں تو بالکل ہی ان پڑھ ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسی عورتیں ملیں گی جو ایک خط بھی لکھ سکتی ہوں۔ علم کی اہمیت زندگی میں جتنی زیادہ ہے، میوؤں کے یہاں اس کی اہمیت اتنی ہی کم نظر آتی ہے۔

گلپاڑہ قصبہ کی تقریباً تمام دوکانیں دوسری اقوام کی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی ایک بھی قابل ذکر دوکان نہیں۔ صبح کے وقت میں قصبہ کے اندر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ دکاندار اپنی دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے ہندی اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جب کہ میوؤں کے لیے اخبار پڑھنا ابھی تک ایسا ہی ہے جیسے چاند پر سفر کرنا۔ اسی بے علمی کی وجہ سے میو تجارتوں میں داخل نہ ہو سکے اور زراعت (زمینداری) جس میں ان کے تمام مرد و عورت اور چھوٹے بڑے لگے رہتے ہیں، ان میں بھی وہ زیادہ ترقی نہ کر سکے۔ تاہم پچھلے اسفار کے مقابلہ میں اس بار مجھے کئی میو زمیندار کے یہاں ٹریکٹر اور ٹیوب ویل نظر آیا جو کہ پہلے نایاب تھا۔ میو ترقی کر رہے ہیں۔ مگر اس کی رفتار اتنی کم ہے کہ خورد بینی مشاہدہ کے ذریعہ ہی اس کو

دیکھا جا سکتا ہے۔

پورے میوات میں سڑک اور بجلی کی وجہ سے کام کی نئی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ بہت سے مقامات جہاں پہلے ویرانہ تھا۔ لوگ ان کو بھوت کی جگہ سمجھتے تھے، وہاں اب پر رونق بازار بن گیے ہیں۔ مگر ان میں میووں کا کوئی قابل مشاہدہ حصہ نہیں۔

میوات کے دیہاتوں کا نقشہ اب بھی تقریباً وہی ہے جو ۲۰ سال پہلے تھا۔ اونچے نیچے راستے، مٹی کی دیواروں کے اوپر چھپر۔ ہم ایک میو کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک طرف سرسوں کے ڈنٹھل سے کھانا پک رہا ہے۔ دوسری طرف بیل بندھے ہوئے بول و براز کر رہے ہیں۔ ایک کنارے دو عورتیں "مشین" چلا کر چارہ کاٹ رہی ہیں۔ غرض رہائش سے لے کر گھر ہستی تک جتنے لوازم ہیں، سب ایک غیر منصوبہ بند احاطہ کے اندر موجود تھے۔ اور اس کا نام مکان تھا۔ آپ کو ایسے میو ملیں گے جن کے گھروں میں بجلی کے بلب لٹک رہے ہوں گے۔ مگر بلب روشن ہو کر جب چاروں طرف کے ماحول کو دکھائے گا تو آپ سوچیں گے کہ وہ یہاں شاید اس لیے روشن ہوا ہے کہ آپ کو بتائے کہ میو لوگ دور جدید کے عین وسط میں بھی دور قدیم کی زندگی گزار رہے ہیں۔

میوات میں آپ سنیں گے کہ فلاں مسلمان عورت کا نام "بسکر" ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی میو کے یہاں جب مسلسل کئی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو وہ اپنی آخری لڑکی کا نام بسکر رکھ دیتا ہے۔ یعنی اے خدا، اب بس کر، اور مزید لڑکی نہ پیدا کر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر لڑکی کا نام "بس کر" رکھ دیا تو اس کے بعد یہ سلسلہ بس ہو جائے گا اور پھر جو اولاد پیدا ہوگی وہ نرینہ اولاد ہوگی ——— یہ وہی ذہن ہے جس کے تحت مہذب قسم کے لوگ اپنی لڑکی کا نام بشریٰ رکھ دیتے ہیں۔

قریبی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ ایک شخص نے پوچھا: کون صاحب اذان دے رہے ہیں۔ جواب دینے والے نے کہا "پلٹو"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کثرت سے اس طرح کے عجیب و غریب نام ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ مجھے یہ بتائی گئی کہ میووں میں یہ رواج ہے کہ ایک لڑکا مر جائے، اس کے بعد ولادت ہو اور دوبارہ لڑکا پیدا ہو تو ایسے لڑکے کا نام

پلٹا یا پلٹو رکھ دیتے ہیں۔ یعنی بدلہ۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے دوسرا لڑکا بدلہ میں دیدیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے عجیب عجیب نام سنائی دیئے۔ مثلاً یہاں تین بھائی ہیں جن کے نام یہ ہیں : سکاری ، لنکاری ، پیکاری ۔ وغیرہ

ایک مقام پر ہماری بس میں میواتی عورتوں کا ایک جھنڈ سوار ہوا۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ لوگ " فاتحہ خوانی " میں شرکت کرکے آرہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میوات میں رسموں کا رواج بہت ہے ، اور اب اس میں ایک مادی پہلو بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس نے پرانی رسموں میں نئی طاقت عطا کر دی ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ مثلاً موت کے بعد فاتحہ کرنا۔ کچھ " دیوبندی " حضرات نے فاتحہ کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے ۔ میو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ ہم خود ان رسوم کو پسند نہیں کرتے ۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جب ایک موت ہو جاتی ہے تو مہینوں تک رشتہ دار لوگ تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں اور مہمان داری اور خاطر تواضع کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ فاتحہ کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ ایک تاریخ کو سب لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک ہی دن دے کر یا کھلا پلا کر چھٹی ہو جاتی ہے ۔

تعزیت اور پرسہ کی موجودہ رسم خود قابلِ ترک ہے ۔ مگر ایک قابلِ ترک کو ترک نہ کرنے کے لیے ایک اور قابلِ ترک کو اختیار کرنا پڑا۔

میوات میں کافی ذہین لوگ پیدا ہوئے ہیں ، اگرچہ بے علمی کی وجہ سے ان کی ذہانت اپنے لیے کوئی بڑا استعمال نہ پا سکی ۔ اس کا اندازہ یہاں کی کہاوتوں اور اشعاروں سے ہوتا ہے جو کسی نے کہے تھے اور اب وہ عوام میں رائج ہیں ۔ مثلاً کسی قدیم میو شاعر کا ایک شعر یہ ہے :

دھنمت کے کانٹو لگے سبھی لگاواں ہات　　نردھن کے کانٹو لگے کوئی نہ پوچھے بات

یعنی دولت مند کو کانٹا چبھ جائے تو ہر ایک اس کا حال پوچھتا ہے ، غریب آدمی کو کانٹا چبھ جائے تو کوئی اس کا حال دریافت نہیں کرتا۔ ایک صاحب نے یہ شعر بتاتے ہوئے کہا : آج یہ حال ہے کہ بڑا آدمی ہے تو اس کے کھلانے پلانے میں زبردست اہتمام ہوگا ، اور غریب آدمی کو صرف معمولی کھانا کھلایا جائے گا۔ لڑکی امیر کے گھر جا رہی ہے تو بہت زیادہ جہیز دیا جائے گا۔ اور اگر لڑکی غریب کے گھر جا رہی ہے تو معمولی جہیز دے کر رخصت کر دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ کسی مدرسہ میں شاندار

عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں تو اس کو خوب چندہ ملے گا، اور کوئی مدرسہ چھپروں میں ہو تو اس کو کوئی چندہ دینے والا نہیں۔ یہی حال زندگی کے تمام معاملات کا ہے۔

میوات میں ایک مثل ہے کہ دو آدمیوں نے طے کیا کہ وہ مل کر گنا بوئیں گے اور جب گنا تیار ہو جائے گا تو اس کو توڑیں گے۔ اب ایک شخص نے کہا کہ " میں گنا توڑوں گا کڑاک سے۔" دوسرے شخص نے کہا: " میں بھی توڑوں گا کڑم کڑاک سے۔" یہ سن کر پہلے شخص نے کہا کہ میں نے تو ایک گنا توڑا تھا، تم نے دو توڑ لیے۔ اس پر تکرار ہوئی، یہاں تک کہ دونوں آپس میں لڑ گیے۔

یہ مثل میووں کی کہانی بھی ہے اور عام مسلمانوں کی کہانی بھی۔ اس وقت تمام مسلمانوں کا حال یہی ہے کہ کرنے کا کام تو کوئی نہیں کرتا۔ البتہ کیا کام کرنا ہے، اس پر خوب بحثیں ہو رہی ہیں۔ گویا گنے کی فصل تو اگائی نہیں گئی، اور گنے کی حصہ داری پر لڑائیاں جاری ہیں۔ بحث میں ہر آدمی آگے ہے، مگر عمل میں ہر آدمی پیچھے۔

گلپاڑہ میں ایک میو حاجی مل خاں نام کے تھے۔ ۱۹۷۸ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے ان سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ نہایت سنجیدہ اور نیک آدمی تھے۔ موجودہ سفر میں ان کے صاحبزادے فیروز خاں سے ملاقات ہوئی۔ اسی کے ساتھ حاجی صاحب مرحوم کے بھتیجے (ملھو) کے لڑکے فخر الدین عرف فجرو بھی ملے۔ یہ لوگ اپنی سادگی، خاموش طبعی اور دینی مزاج کے معاملہ میں حاجی مل خاں مرحوم کی تصویر ہیں۔

گلپاڑہ سے رسول پور تقریباً تین کیلو میٹر کے فاصلہ پر اندر کی طرف ہے۔ یہاں سڑک نہیں۔ میں اندرون میوات کا نقشہ دیکھنے کے لیے یہاں جانا چاہتا تھا۔ یہ فاصلہ ٹریکٹر کے ذریعہ طے کیا۔ چونکہ اس موسم میں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس لیے سارا راستہ گرد کی دلدل بنا ہوا تھا۔ ٹریکٹر کو فیروز خاں اور فجر الدین چلا رہے تھے۔ وہ ایک پرشور مشین کے خاموش ڈرائیور تھے۔ یہ سفر اس طرح طے ہوا کہ کپڑے گرد میں اٹ رہے تھے۔ گدّی کے بجائے لوہے پر نشست تھی اور مسلسل ہچکولے اس کے علاوہ تھے۔

میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جس نے کار کی سواری کی ہے اس کو ٹریکٹر کی سواری بھی کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر شخص جو ٹریکٹر پر بیٹھتا ہے اس کو کار پر بیٹھنا چاہیے۔ ان دونوں سفروں کا

تقابل ایک عظیم دینی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اتنا موثر ہے کہ اس سے زیادہ موثر میرے علم میں کوئی دوسری چیز نہیں۔

جس آدمی نے بھی دونوں چیزوں کی سواری کی ہے، وہ جانتا ہے کہ ٹریکٹر کے ذریعہ اگر سفر کیا جائے تو منزل پر آدمی اس طرح پہونچتا ہے کہ وہ تھک چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب ایک اچھی کار پر سفر کرتا ہے تو وہ اپنی منزل پر بالکل تروتازہ اترتا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ کار کے پہیوں کے ساتھ جھٹکے کو سہنے والا پرزہ (Shock absorber) لگا ہوا ہوتا ہے، جب کہ ٹریکٹر کے اندر ایسا پرزہ نہیں ہوتا۔ گویا ٹریکٹر وہ سواری ہے جو اپنے اوپر آنے والے جھٹکوں کو مسافر تک پہنچاتی رہتی ہے، جب کہ کار وہ سواری ہے جو جھٹکوں کو خود اپنے آپ پر سہہ لیتی ہے، وہ ان کو مسافر تک پہنچنے نہیں دیتی۔

لوگوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے اکثر غصہ اور انتقام کے جذبات دل کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں مومن کو کیا کرنا چاہیے۔ مومن کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس قسم کے تمام نفسیاتی جھٹکوں کو خود اپنے اوپر سہے، وہ ان کو دوسرے شخص تک نہ جانے دے۔ وہ لوگوں کے درمیان کار کی طرح رہے نہ کہ ٹریکٹر کی طرح۔

رسول پور میں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عبدالرشید عرف دھنوتالی اور عبدالرحیم عرف خردل سیدھے سادے میواتیوں کا مکمل نمونہ نظر آئے۔ کار اور ٹریکٹر کے مذکورہ فرق کو شاید وہ شعوری طور پر نہ جانتے ہوں۔ مگر فطرت کے زور پر عملاً وہ اسی قسم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ حدیث کے الفاظ میں، ان کے طریق زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ اور اگر نفع نہ پہنچا سکو تو ان کو اپنے نقصان سے بچاؤ۔

دہلی جیسے شہر میں مشکل ہی سے کبھی آسمان اپنے قدرتی نیلے رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کی کھلی فضا میں آسمان اپنے اصلی نیلے رنگ میں دکھائی دیا۔ آسمان کا یہ رنگ جو مختلف طبیعی اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اتنا زیادہ جاذب نظر ہے کہ آسمان کے لیے اس سے زیادہ جاذب نظر رنگ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنے آخری معیاری نمونہ پر ہے۔ خواہ ایک گھاس ہو یا ایک شیر یا اور کوئی چیز۔ کسی بھی چیز کا کوئی دوسرا اس

سے بہتر ماڈل تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ مخلوقات کا معیار کمال پر ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا خالق بھی آخری معیار کمال پر ہے۔ کامل خالق کے بغیر کامل تخلیق کا وجود ممکن نہیں۔

نیلے آسمان کے نیچے ابھری ہوئی پہاڑیاں، ہرے بھرے درخت، آکسیجن سے بھری ہوئی خالص ہوا فطرت کے اس حسین ماحول میں انسان اپنے آپ کو خدا کے بالمقابل محسوس کرنے لگتا ہے آج کل شہروں کے لوگ اپنے فرصت کے اوقات کو سینما اور ٹیلی ویژن کے ماحول میں گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس انھیں اپنے فرصت کے اوقات کو شہر سے باہر فطرت کے ماحول میں گزارنا چاہیے۔ "ٹیلی وژن" آدمی کو دوبارہ مصنوعاتِ انسانی کی اسی دنیا میں گم کر دیتا ہے جس میں وہ اس سے پہلے گم تھا۔ اس کے برعکس کھلے ہوئے جغرافیہ کا ماحول آدمی کو مصنوعاتِ خداوندی کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے، وہ دنیا جہاں انسان اور خدا آمنے سامنے ہو جاتے ہیں۔ جہاں آدمی اپنے رب سے ملاقات کرتا ہے۔ جہاں آدمی اپنے رب سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ جہاں وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت اعلیٰ کو پالیتا ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۷ کی صبح کو واپسی ہوئی۔ گلپاڑہ سے دوبارہ میں بذریعہ بس روانہ ہوا اور پہاڑی، بیواں، فیروزپور، نوح، سوہنا، گوڑگاؤں ہوتے ہوئے ۱۲ بجے دن میں دہلی واپس پہونچا۔

زیر طبع کتابیں

۱۔ کاروانِ اسلام
۲۔ نشری تقریریں
۳۔ پیغام عمل
۴۔ عقلیاتِ اسلام
۵۔ تجدید دین

ڈاک پتھر (دہرہ دون) میں ۲۵ جون ۱۹۸۸ کو سیرۃ النبی کا جلسہ تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ ۲۵ جون کی شام کو سیرت کے اخلاقی پہلو پر خطاب کیا۔ اس سفر کے دوران سہارن پور اور ڈاک پتھر میں انفرادی مجلسیں ہوئیں۔ اور سوال وجواب کی صورت میں اظہار خیال کیا گیا۔ یہ سفر اس طرح ہوا کہ ۲۴ جون کی شام کو دہلی سے سہارن پور پہنچے۔ رات کو سہارن پور میں قیام کیا۔ ۲۵ جون کو ڈاک پتھر کا سفر ہوا۔ ڈاک پتھر سے روانہ ہو کر دہرہ دون آئے۔ اور پھر وہاں سے روانہ ہو کر ۲۶ جون کو دہلی واپس آگئے۔

احمد آباد (گجرات) سے چھیپا برادری کا ایک ماہنامہ گجراتی زبان میں نکلتا ہے۔ اس کا نام چھیپا بلیٹن ہے۔ اس ماہنامہ میں ہر ماہ الرسالہ کے مضامین گجراتی میں ترجمہ کرکے شائع کیے جاتے ہیں۔ اس طرح گجراتی داں حلقہ میں الرسالہ کا پیغام مسلسل پہنچ رہا ہے۔

۳۔ ایک خاتون لکھتی ہیں: الرسالہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ مذہب پر جان دینے کی باتیں تو سب کرتے ہیں۔ لیکن انسانیت کے ساتھ جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے الرسالہ۔ (مسز ناہید ایم اے، بنگلور)

۴۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جولائی ۱۹۸۸) میں صدر اسلامی مرکز کا ایک انگریزی آرٹیکل چھپا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو نے اپنے "جہاں نما" پروگرام کے تحت اس آرٹیکل کا خلاصہ اردو میں نشر کیا۔ اس طرح اسلامی مرکز کا تعمیری پیغام بیک وقت لاکھوں لوگوں تک پہونچ گیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے اس طرح کی نشریات کئی بار آچکی ہیں۔ مثلاً صدر اسلامی مرکز کا طویل انٹرویو شائع شدہ اخبار اردو (۲۹ جنوری ۱۹۸۸) کو آل انڈیا ریڈیو نے مکمل طور پر نشر کیا تھا۔ وغیرہ۔

۵۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ کا مضمون "قیادت کا دیوالیہ پن" بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ خداوند کریم آپ کی حیات دراز کرے اور ہم لوگوں کو ان معاملات میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ آپ کے متعلق اخبارات میں پڑھتا ہوں۔ میں خود ایک جماعت سے متاثر ہوں۔ ان حضرات سے بھی گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تقسیم ہند کے وقت کا کچھ ہوش مجھے

ہے۔ اس زمانہ میں بالکل یہی باتیں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی عام تھیں۔ جس کا نتیجہ اب بھگت رہے ہیں۔ اور مزید بھگتیں گے۔ (احسان احمد۔ رام نگر چوک، گونڈیہ)

۶۔ الرسالہ نومبر ۱۹۸۷ صفحہ ۴۵ پر ایک بدھسٹ پروفیسر کا تاثر الرسالہ کے بارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کو پڑھ کر جناب اسلم احمد (بتیا، بہار) نے اپنی طرف سے سالانہ زرتعاون ادا کر کے ان کے نام الرسالہ انگریزی جاری کرایا ہے۔ یہ نہایت مناسب طریقہ ہے، خدا کے فضل سے بہت سے ساتھی ایسا کر رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی طرف سے غیر مسلم صاحبان کے نام انگریزی الرسالہ جاری کرانا چاہیے۔ یہ دعوتی ذمہ داری کو ادا کرنے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ ہے۔

۷۔ الرسالہ کی مقبولیت اب خدا کے فضل سے اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس کے مخالفین بھی اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے اپنے چار صفحہ کے خط (۱۱ جون ۱۹۸۸) میں الرسالہ پر سخت تنقید کی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ آخر میں لکھتے ہیں: آپ کا پرچہ (الرسالہ) تو اب سنلائٹ صابن کی طرح چل چکا ہے۔ آپ اس میں کچھ بھی لکھیں، کیا ہوتا ہے (لوگ بہر حال اس کو پڑھیں گے) عبدالصبور، اجین۔

۸۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے تذکیر القرآن کی دونوں جلدیں حاصل کیں۔ ان کو پڑھ رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ حقیقت میں ایک ایسی تفسیر مجھے ملی ہے جو قرآن کے اصلی مقصد کو واضح کر رہی ہے۔ (الطاف حسین شاہ انجینیر، مٹن، کشمیر)

۹۔ ایک صاحب اپنے خط (۲۶ جولائی ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: میں بحمداللہ شروع سے آپ کی تحریروں کو بغور پڑھ رہا ہوں۔ اس مطالعہ سے مجھے نہ صرف دین کی بابت معلومات ہوئی بلکہ اس سے میرے اندر ایک نیا دینی مزاج بنا ہے۔ میرے اندر ایک یقین کامل پیدا ہوا ہے۔ پہلے میں ہر معاملہ میں اندیشوں میں گھرا رہتا تھا۔ مطالعہ کے بعد میں اپنے آپ کو قناعت سے واقف، صبر کرنے والا اور ایک یقین والا انسان پاتا ہوں جس میں نہ گھبراہٹ ہے اور نہ پریشانی۔ (اقبال احمد، مرادآباد)

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط ۲۵ جون میں لکھتے ہیں: بندہ بڑے شوق سے ہر ماہ الرسالہ پڑھتا ہے۔ میں ایک مسجد میں پیش امام ہوں اور آپ کے مضامین اپنے وعظ میں بیان کرتا رہتا

ہوں۔ نوجوانوں کے ذریعہ ایک موقع پر مجھے یہ رپورٹ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ اپنا بیان صبر و اعراض کے عنوان پر نہ دیتے تو ہم نے طے کیا تھا کہ "ہم نوجوان لوگ پولیس چوکی کو جلائیں گے۔ آپ کا بیان سن کر ہم اس سے رک گیے"۔ یہ تمام فائدے الرسالہ کی تحریروں کا نتیجہ ہیں۔ (سید انور، پونہ)

۱۱- صدر اسلامی مرکز کی آواز میں ایک نیا کیسٹ تیار کیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے "میدانِ عمل" اس میں دعوت کی اہمیت کو ایک گھنٹہ کی تقریر میں بتایا گیا ہے۔

۱۲- جب سے تذکیر القرآن کی دونوں جلدیں شائع ہوئی ہیں، اس کے انگریزی ترجمہ کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ مثلاً زینب شیخ محمد حبیب اللہ نے نیوزی لینڈ سے لکھا ہے کہ کیا تذکیر القرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا ہے۔ اس کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے (۲۹ جون ۱۹۸۸) اس سلسلہ میں اطلاع دی جاتی ہے کہ تذکیر القرآن کے انگریزی ترجمہ کا کام برابر جاری ہے۔ تاہم ابھی اس کا اندازہ نہیں ہے کہ اس کو کتابی صورت میں لانے کے لیے کتنی دیر لگے گی۔

۱۳- ایک صاحب اپنے خط ۲۰ جون ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں : ہم تمام بہن بھائی آپ کی تصنیفات اور الرسالہ کا بصد شوق مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم آپ کے خیالات سے پوری طرح متفق ہیں۔ اس بات کی کوشش پوری طرح جاری ہے کہ آپ کی ہر بات پر عمل ہو۔ آپ کی تصنیفات کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات جس کی زندگی میں نہیں ہیں وہ خدا کی اس زمین پر جینے اور زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ (نیر ربانی، بنگلور)

۱۴- ایک صاحب کراچی سے لکھتے ہیں : پہلے مجھے سوشلسٹ مفکرین اور غیر مسلم مفکرین کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز اردو بازار میں اسی قسم کی کتابیں خرید رہا تھا کہ میرے دوست نے کہا کہ تم ان کتابوں پر اپنی رقم کیوں ضائع کرتے ہو۔ چلو مولانا وحیدالدین صاحب کی کتابیں خریدو۔ میں مولانا لوگوں سے بہت الرجک تھا۔ مگر دوست کے اصرار پر آپ کی دو کتابیں، اللہ اکبر، اور رازِ حیات خرید لیا۔ جب میں نے یہ کتابیں پڑھیں تو مجھے اپنے بھائیوں سے شکوہ پیدا ہوا کہ کسی نے مجھے نہیں بتایا کہ اسلام کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے راہ بتانے والا مل گیا۔ اب میں اس کو سنہری اصول بنا کر اس پر عمل کروں گا، انشاء اللہ (مصطفیٰ کمال، کراچی)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے راہل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ـ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ـ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 October 1988 No 143